غلام گردش
(افسانے)
عابد سہیل

غلام گردش

(افسانے)

عابد سہیل

کتاب کا نام	:	غلام گردش
مصنف	:	عابد سہیل
ناشر	:	عابد سہیل
گرد پوش	:	مصلح احمد
پہلا ایڈیشن	:	دسمبر ۲۰۰۶ء
طباعت	:	کاکوری پریس۔ لکھنؤ
کمپوزنگ	:	یونک کمپیوٹر سینٹر، ندوہ روڈ، لکھنؤ۔
تعداد	:	چھے سو (۶۰۰)
قیمت	:	۱۶۰ روپے
مصنف کا پتہ	:	۲۲۔ ایس پی، سیکٹر 'سی'۔ علی گنج لکھنؤ۔ 226 024
تقسیم کار	:	**ایجوکیشنل بک ہاؤس** ایم۔ یو۔ مارکیٹ، علی گڑھ

NAME OF BOOK	:	**Ghulam Gardish**
AUTHOR	:	**Abid Suhail**
Publisher	:	Author
First Edition	:	December 2006
Number of Copies	:	600
PRINTING PRESS	:	Kakori Press, Lucknow
PRICE	:	Rs. 160/-
Distributors	:	Educational Book House M.U. Market- Aligrah

Author's Address

22 S.P., Sector "C,"- Aliganj,
Lucknow - 226 024

غلام گردش

اور

دس دوسرے افسانے

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ،
کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

بیٹی صبا، مقبول قریشی

اور

ان کے بیٹوں

بلال اور علی عمر

کے لیے

فہرست

دار و رسن کی آزمائش

ایک ادھوری کہانی

۱۹۵۴ء کا ایک دن

اُس نے بہت دھیرے سے دونوں پٹ کھولے لیکن ماں نے جو، اب بہت اونچا سننے لگی تھی دروازہ کھلنے کی آواز سُن لی اور کہا، ''کب آؤ گے؟''

''جلد ہی لوٹ آؤں گا ماں،'' اُس نے کہا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے اس جملے کے بعد کیا ہوگا۔ اور وہی ہوا۔ ماں کی آواز سننے کے انتظار میں اُس نے پیر وہیں جما لیے۔

''یہ تو تُو نے کل بھی کہا تھا،'' ماں نے کہا۔ اُس کی آواز میں غصہ نہیں تھا، بس تھوڑا سا دُکھ تھا اور اُس سے زیادہ بے چارگی۔

''کل کی بات دوسری تھی اماں،'' اُس نے ماں کی آواز کے بوجھ کا اندازہ کر کے ''ماں'' کے بجائے ''اماں'' کہا۔

''اور پرسوں کی بات بھی دوسری تھی؟''

وہ کیا جواب دیتا۔ آواز اُس تک پہنچی تو بہت دیر میں تھی، جیسے بہت دور سے

آئی ہو، لیکن اس کا خیال کر کے ہی جیسے اُس کے پیر بندھ گئے تھے۔ اُس نے گردن دھیرے سے پیچھے کی طرف گھمائی۔ ماں اب بھی جانماز پر بیٹھی تھی۔ کونا ذرا سا موڑ دیا تھا اُس نے۔

چھینٹ کے چوڑی دار پیجامے، ملگجے سے کرتے اور پیلے دوپٹے میں ماں کا سرخ سفید چہرہ مَیلا مَیلا لگ رہا تھا، لگ نہیں رہا تھا ہو ہی گیا تھا۔

اُسے ماں کی چھے سات سال پہلے کی صورت یاد آئی۔ ابا کہہ رہے تھے۔

''میں بڑھا تا جا رہا ہوں اور تم، خدا نظر بد سے بچائے، ماشاءاللہ ویسی کی ویسی ہو جیسی۔۔۔۔''

یہ بات اُنہوں نے بہت دھیمے لہجے میں کہی تھی کہ بیٹا نہ سن لے۔ لیکن اُس نے سن لی تھی۔ پوری نہیں، کہ اُس کے آنکھ، کان سب ماں کو دیکھنے لگے تھے جس کا چہرہ شرم سے اور بھی لال ہو گیا تھا اور وہ تخت سے اُٹھ کر گھڑونچی سے پاس کٹورے میں انڈیل کر غٹ غٹ پینے لگا تھا جیسے اُس نے کچھ بھی سُنا نہ ہو۔ ماں نے کھڑے کھڑے پانی پینے پر اُسے نہیں ٹوکا تھا، پہلی بار، شاید اِس لیے کہ وہ جہاں بیٹھی تھی وہیں شرم کے مارے گڑیا بن گئی تھی۔

اتنی پرُانی بات کہاں سے یاد آ گئی۔ اُس نے سوچا۔

''نہیں ماں، آج جلدی آ جاؤں گا۔ سورج ڈوبنے سے پہلے''

وہ جانتا تھا کہ یہ بات سچ نہیں ہے۔ لیکن جھوٹ بھی نہیں ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کب لوٹ پائے گا۔

''وہ زندہ ہوتے تو۔۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئیں پھر جیسے کنویں سے آواز آئی، بوجھل، دل کو چھوتی ہوئی، ''تو تجھے مارے مارے پھرنے نہ دیتے۔''

افسردگی کی ایک دُھند جو کبھی کبھی جیسے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے اُس کے دل کے آس پاس گول گول چکر لگانے لگی اور اُس کے دونوں پیر مَن مَن بھر کے ہو گئے۔ اُس نے پلٹ کر ماں کو نہیں دیکھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اُس نے یہ کیا تو وہ تھر کا

ہو جائے گا اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ماں کی نظریں اُس کی پیٹھ سے ٹکرا رہی ہیں، اُس نے محسوس کیا۔ ہلکی سی چبھن بھی تھی۔ اُس نے پیٹھ پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرا۔ اُس کا خیال ٹھیک تھا۔ چبھن کچھ کم ہو گئی تھی۔

اتنی دیر میں اُس کی ہمت لوٹ آئی تھی، اُس نے ادھر اُدھر دیکھے بغیر پیر آگے بڑھائے، دہلیز پار کی اور مُڑے بغیر ہاتھ پیچھے کر کے دروازہ بند کر دیا۔

ماں اب بھی دیکھ رہی ہوگی۔ اُس نے سوچا۔

وہ جانتا تھا کہ ماں دل ہی دل میں کیا کہہ رہی ہوگی لیکن اُس نے خیال کو دل سے جھٹک دیا اور تیز تیز آگے بڑھنے لگا جیسے اُسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو۔ اُس نے اسی طرح گھر کے باہر کا چھوٹا سا میدان پار کیا، پھر زینے اترنے کے بعد چند قدم چل کر سڑک کے کنارے ٹھہر گیا، دونوں طرف دیکھا اور اپنے آپ سے پوچھا۔

''کس طرف چلا جائے؟''

اُس نے سوچا کہ تقریباً ہر روز کی طرح پہلے وہاں جائے جہاں سات آٹھ مہینوں سے ایک ہی جواب مل رہا ہے۔

''ابھی نہیں، اگلے ہفتے کی اُمید ہے''

اور جو یہ جواب آج نہیں ملا اور ہفتے بھر بعد کی اُمید آج ہی پوری ہو گئی تو؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اور ہو بھی جائے تو کیا پریشانی۔ سات دن ملتے ہیں کم سے کم، اس کے بعد انٹرویو کی تاریخ ہوئی ہے۔ یہ خیال تو خیر ایک تسلّی تھی جو اُس نے خود کو دی تھی، اصل میں تو وہ ''ابھی نہیں۔ اگلے ہفتے کی اُمید ہے'' سننے سے ڈر رہا تھا۔

اُس کی جیب میں پانچ روپے کا نوٹ تھا، یہ نوٹ کل بھی تھا، پرسوں بھی اور کئی دن پہلے بھی۔ اُس نے پینٹ کی پیچھے کی جیب پر ہاتھ رکھ کر اُس کے ہونے کا خود کو یقین دلانا چاہا۔ کچھ پتہ نہیں چلا۔ دو اُنگلیاں اندر ڈالیں۔ دہرا کیا ہوا نوٹ اُسی طرح موجود تھا جیسا رکھتے وقت تھا، کئی دن پہلے۔ اِس دوران سارا سارا دن باہر گزارنے، چائے

سگریٹ پینے اور کبھی کبھی دن کا کھانا کھانے کے باوجود اُس نے اس نوٹ کو ہاتھ لگانے کی نوبت نہ آنے دی تھی اور مقدس ہیکل کی طرح اُس کی حفاظت کرتا رہا تھا۔

دراصل اُس کی حفاظت کا کام اُس نے اپنے تینوں دوستوں کے سپرد کر دیا تھا، اُنہیں بتائے بغیر۔

وہ خراب لڑکے نہیں تھے۔ بلاضرورت روپے خرچ کرنے کے علاوہ اُن میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ لیکن اچھے بھی نہیں تھے۔ ایک آدھ کتاب اور دو دو تین کاپیاں لے کر وہ اپنے اپنے گھروں سے آتے تھے۔ پہلا پڑاؤ بتانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ملنے کے لیے جو وقت ملنے کا طے کرلیا جاتا اسی وقت وہ ایک دوسرے کا انتظار کرتے اور چائے پینے کے بعد اس چھوٹے سے چائے خانے سے رُخصت ہونے لگتے تو ہاتھ بڑھا کر کاونٹر کے پیچھے کی الماری میں کتابیں رکھ دیتے اور گھر واپس ہوتے وقت یہیں سے کاپیاں کتابیں اُٹھا لیتے۔ وہ کبھی کبھی کالج بھی چلے جاتے۔ کسی دوست سے ملنے۔

دو تین کتابیں اُس کے پاس بھی تھیں، لیکن اُسے یہ ڈھونگ رچانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اب اُس کا نام کلاس میں پکارا ہی نہیں جاتا تھا کیوں کہ ہر کلاس کا حاضری رجسٹر مہینے میں دو بار کیشیئر آفس ضرور جاتا تھا۔

''فیس جمع کیوں نہیں کر دیتا؟'' اُن میں سے ایک نے کہا۔

وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

''کردوں گا، کردوں گا'' اُس نے کہا۔ جانتا تھا کہ بات مذاق کی نذر نہ ہوگئی تو کوئی نہ کوئی چپکے سے پیسے جمع کر دے گا۔

''یہ اور فیس جمع کرے گا؟ یہ تو ہر ہفتے اُمید سے ہوتا ہے''

سب ہنس دیے۔ بات مذاق میں اُڑ گئی۔

مذاق کا جواب اُسے فوراً ہی سوجھ گیا لیکن وہ ٹال گیا۔ فیس کے بارے میں کوئی بات کرے، یہ اُسے اچھا نہیں لگا تھا، پان سگریٹ، چائے، کبھی کبھی کی پکچر اور ہفتے میں ایک آدھ بار کے دن کے کھانے کا خرچ وہ ضرور اُٹھاتے تھے مگر اس میں سب ہی

شامل ہوتے تھے، اس لیے اس سب کی بات ہی دوسری تھی لیکن فیس، کوئی دوسرا جمع کردے! یہ وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

پچھلے تین چار دنوں کے دوران سگریٹ خریدتے وقت وہ اپنا ہاتھ پینٹ کی پیچھے والی جیب کی طرف دھیرے دھیرے بڑھاتا رہا تھا پھر دوسروں کے ہاتھ بہت تیز ہوتے اور وہ اُن کی جیبوں میں جلدی سے پہنچ جاتے۔ کچھ بھی ہو، پانچ روپے کا اُس کا نوٹ جیب میں اب بھی آرام کر رہا تھا۔

انٹرول میں چائے پیتے پیتے اُن میں سے کسی نے کہا

''وہ اُس دن تو نے کیا کہا تھا؟''

''کس دن؟''

''وہی خواب والی بات؟''

''خواب والی؟''

''ہاں، ہاں، وہی خواب والی جس میں ''بھیانک'' بھی تھا''

''اچھا، وہ۔ زندگی اتنی بھیانک ہوگئی ہے کہ خواب دیکھے بنا چارہ نہیں''

''واہ کیا بات ہے۔ میں کہوں ایسی باتیں تجھے سوجھ کیسے جاتی ہیں!''

''جب اور کچھ نہیں ہوسکتا تو ایسی باتیں ہی سوجھتی ہیں؟

دوستوں میں کوئی بھی اُس کی بات سمجھ نہ سکا۔ لیکن ہنس سب ہی دیے۔

پکچر دیکھنے کے بعد حضرت گنج میں ونڈو شاپنگ کرتے کرتے چار بج گئے۔ شاید اُن کو بھی دیر سے گھر لوٹنے پر ٹوکا گیا تھا اِس لیے وہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ شام یہیں ہوجائے۔ اسکوٹر تینوں نے جہاں چھوڑی تھی وہ جگہ زیادہ دور نہ تھی۔ بس یہی پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر۔

تکو نے پارک کے پاس اُن کی نظر ایک عورت پر پڑی۔ اُس کے ایک ہاتھ میں بھاری تھیلا تھا جو وہ بائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے تھی۔ بوجھ سے اُس کا ہاتھ سیدھا ہوگیا تھا، یا شاید ایسا ہی رہا ہو اور بس اُسے لگ رہا ہو۔ دوسرے ہاتھ سے وہ ڈبا تھامے

تھی جو اُس کے بائیں کندھے پر رکھا ہوا تھا۔ تکلیف اُسے ضرور ہو رہی ہوگی لیکن وہ ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ دوسری طرف سے ایک گائے بھاگتی ہوئی آئی تو اُس نے ایک پیر فٹ پاتھ سے نیچے سڑک پر رکھ دیا، ذرا سی ڈگمگائی۔ لیکن سنبھل گئی۔

''بے چاری'' اُن میں سے کسی نے کہا۔

وہ رُک گیا۔ گردن اُس کی طرف جھکائی ''ماں'' تھیلا مجھے تھما دو''

''نہیں بیٹا! تم روز اس وقت کہاں ملو گے''

''چے۔ چے۔ کتنا بوجھ لادے ہے بے چاری''

''احسان کا بوجھ اُس سے بھی بھاری ہوتا ہے''

''کیا بات کہی ہے! تیری ایسی ہی باتوں کے تو ہم عاشق ہیں''

اُس کی ایسی باتوں کے وہ عاشق ضرور تھے لیکن ان کی گہرائی سمجھ میں کسی کے نہیں آتی تھی۔

کتابیں چائے خانے سے لے کر تینوں آ گئے، تو اس نے کہا

''ایک ایک چائے اور ہو جائے''

چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک گردن ہلی، دو دو ہتھیلیاں ایک دوسرے ٹکرائیں، ہلکی سی آواز ہوئی اور وہ چاروں چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

یکایک وہ اپنی کرسی سے اُٹھا، پیچھے پیچھے ایک دوست بھی کاؤنٹر تک پہنچ گیا لیکن اس کے ہاتھ کو جیب میں داخل ہونے میں کم دیر لگی۔ دوست دیکھتا رہ گیا۔

اپنے ہاتھ کی تیزی پر وہ دل ہی دل میں بہت خوش تھا۔

سورج ڈوبنے سے پہلے وہ گھر پہنچا تو ماں خوش ہو گئی۔

''میں جانتی تھی تو آج دیر نہیں کرے گا''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، کپڑے بھی نہیں بدلے اور تخت پر لیٹ گیا۔

ماں نے نماز پوری کی، جائے نماز لپیٹ کر تخت پر سرہانے کی طرف رکھ دی۔ تسبیح اس کے اوپر اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''کچھ کھائے گا نہیں؟''

اُس نے جواب نہیں دیا، تو اُس نے کہا

''کچھ کھالے، پھر سو رہنا''

اب بھی کوئی جواب نہیں ملا تو اُس نے جھک کر دیکھا۔ ''سو گیا ہے کیا؟ اس عمر کی نیند ایسی ہی ہوتی ہے، ہر وقت آنکھوں میں بیٹھی رہتی ہے، ذرا کی ذرا میں ٹانگیں پسار لیتی ہے۔''

اُس نے ماں کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، ایسے کہ وہ اُس کا چہرہ نہ دیکھ پائے۔

''جاگ رہا ہے تو کچھ کھالے۔ میں سمجھی تھی سو گیا۔''

''نہیں ماں رہنے دے۔۔۔''

''کیوں نہیں کھائے گا۔ مجھے بھی تو بتا، دن میں کیا کھایا تھا، میرے لیے نہیں لایا؟ میں نے صبح ہی کہہ دیا تھا، تو آجائے گا تب ہی کھانا کھاؤں گی''

''تو نے کھانا نہیں کھایا؟'' اُس نے پوچھا اور کروٹ لی۔ بھول گیا کہ اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ اُس نے جان بوجھ کر رکھا تھا۔

''ارے تو، تو رو رہا ہے''

اُس نے ایک سسکی لی۔

''کیا ہوا؟'' ماں نے اپنے ہاتھ سے اُس کے سر پر زور دیا۔

اُس نے ایک بار پھر سسکی لی۔

''بتا تا کیوں نہیں، کچھ تو بول''

اُس نے ماں کی آنکھوں میں دیکھے بغیر کہا

''ماں، وہ پانچ روپے خرچ ہو گئے''

اب اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

سارے ہی افسانے ایسے ہوتے ہیں جو پورے کبھی نہیں لکھے جاتے، اس لیے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کب شروع ہوئے۔ اسی طرح وہ کبھی ختم ہونے کو نہیں آتے۔ بس ہوتے رہتے ہیں، بُنے جاتے رہتے ہیں۔ کون سا افسانہ ہے جو بالکل شروع سے شروع ہوا ہو اور جہاں ختم ہوا ہو وہاں سچ مچ ختم ہو گیا ہو؟ ''اُس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا''۔ اس جملے پر افسانہ ختم ہو گیا۔ لیکن کیا واقعی ختم ہو گیا؟ آنسو بہہ رہے ہوں تو افسانہ ختم کیسے ہو سکتا ہے؟

کوئی اور اسی جگہ سے دوسرا افسانہ شروع کرے گا یا پھر کچھ اور پہلے سے لکھے گا اور کچھ اور آگے تک لے جائے گا۔ شاید نہیں، یقیناً۔

■ ■

دستک کس دروازے پر

پچھلے تین چار روز سے وہ روبینہ کو سمجھا رہا تھا کہ کچھ ہوگا نہیں، بس افواہیں ہیں۔ اور اگر حالات ذرا سے بھی بگڑے تو وہ اُسے اور بچوں کو اُس کے میکے پہنچا دے گا۔ ''وہاں کوئی خطرہ نہیں، دُور دُور تک بس اپنے ہی اپنے۔۔۔''۔ وہ جملہ پورا کرتے کرتے رُک جاتا کیوں کہ اُس سے زیادہ کہنے کی اب ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ دیتا، جو سب کو نہ صرف معلوم تھی بلکہ سوچ میں بھی اب آگے آگے رہنے لگی تھی۔ اُسے کہا جائے یا نہ کہا جائے کیا فرق پڑتا ہے، رہتی تو وہ اپنی جگہ ہے ہی۔ پھر بھی کوئی چیز دل کے اندر ہی اندر، خود اُس خیال کو کاٹتی ہوئی محسوس ہوتی۔

اُسے تنہا چھوڑنے کے لیے روبینہ تیار ہوتی نہ دونوں بچے۔ ''جائیں گے تو سب جائیں گے، ہم آپ کو یہاں نہیں چھوڑیں گے'' وہ کہتے۔

وہ اُنہیں سمجھاتا ''دیکھو ہر آدمی تو مجھے یہاں جانتا ہے۔ کئی تو ایسے بھی ہیں جنہوں نے برسوں میرے ساتھ کام کیا ہے، اُن سے پرانی دوستی ہے۔ میں بھی چلا جاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گے؟ یہی نا کہ ہم پر بھی بھروسہ نہیں کیا، کتنی بڑی بات ہوگی، ہوگی نا؟۔

ویسے تو کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں لیکن۔۔۔۔''

یہاں تک پہنچتے پہنچتے اُسے لگتا جیسے گلے میں کوئی چیز اٹک گئی ہو جسے ہٹانے کے لیے وہ زور سے کھنکھارتا اور جب اُسے اندازہ ہوتا کہ دھیمی سی آواز نکلنے بھر کی جگہ بن گئی ہے تو کہتا ''پھر بھی بچّوں اور عورتوں کی بات دوسری ہے''۔

''یہ نہیں ہو سکتا ابو'' بیٹی ضد کرتی۔

پچھلے تین چار دنوں میں یہ جملے اتنی بار دہرائے گئے تھے کہ ہر ایک کو اپنا اپنا ڈائلاگ یاد ہو گیا تھا اور شاید خیال کی رَو کو کاٹنے اور گلے میں اٹکنے والی چیزوں کو اپنا اپنا رول بھی اور یہ بھی کہ کس کو کس وقت کیا کہنا ہے اور کس کو کس وقت کیا کرنا ہے، نہ ذرا سا آگے نہ ذرا سا پیچھے۔

لیکن جب فیصلہ کی گھڑی آئی تو کسی کو کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اُس نے جلدی جلدی گیرج سے گاڑی نکالی، سب اُس میں خاموشی سے بیٹھ گئے، کار کے اندر کی روشنیاں بجھا دی گئیں اور وہ روبینہ اور بچّوں کو اُس کے میکے پہنچانے کے بعد سب کے روکنے کے باوجود ضد کر کے کالونی والے اپنے مکان لوٹ آیا اور اُس نے اُنہیں اطمینان دلانے کے لیے فون کر کے اپنی بخیریت واپسی کی اطلاع بھی دے دی۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔۔۔۔ یہ نہیں کہ اندھیرا ہونے کے بعد بھی سامنے والے پارک میں ٹہلتے رہیں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں'' اس نے کہا ''اُمیش آ گیا ہے، ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے، اسی لیے فون کرنے میں تھوڑی سی دیر ہو گئی''

بات ختم کرنے سے پہلے اُس نے کہا، ''تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔''

وہ جملہ پورا بھی نہ کر پایا تھا کہ اُمیش نے ڈرائنگ روم کے دروازہ کا پردہ ذرا سا کھسکا کر جھانکا اور چاروں طرف آنکھیں گھمائیں۔

''بھابھی جی کہاں ہیں؟ کیا ابھی سے سو گئیں، چائے ملے گی نا؟''

کیوں نہیں، کیوں نہیں'' وہ سوال کے پہلے حصّے کو کچھ ایسے ٹال گیا جیسے اُس

نے سنا ہی نہ ہو اور اُمیش کو ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور خود بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں لیکن اُس کے بعد بھی نہ چائے آئی نہ برتنوں کی کھڑ پڑ سنائی دی تو اُمیش نے پھر پوچھا۔

''بھابھی کی صورت بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ معاملہ کیا ہے؟ بچے تو خیر سو گئے ہوں گے۔۔۔''

''وہ۔۔۔وہ۔۔۔اصل میں روبینہ کے والد کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔۔۔ ہے۔۔۔ کوئی خاص نہیں۔۔۔ ڈاکٹر نے۔۔۔'' اُس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ہنسنے کی ذرا سی کوشش کرتے ہوئے یہ بھی جوڑ دیا ''عورتوں کی عادت تو تم۔۔۔ ہر ایک جانتا ہے۔۔۔ ذرا سا کچھ۔۔۔ چاہے ہو چاہے نہ ہو۔۔۔ آنسو بہانے لگتی ہیں۔۔۔''

اتنی ذرا سی بات اُس سے کہتے ہی نہیں بن رہی تھی۔ جملہ بیچ ہی میں ٹوٹ جاتا اور کوئی چیز جیسے بار بار گلے میں اٹک جاتی اور جب وہ کچھ کہنے کے قابل ہوتا تو نئے جملے کا پچھلے جملے سے ربط ٹوٹ جاتا۔ وہی بات نئے طریقے سے کہنے کی کوشش کرتا لیکن چند ہی الفاظ ادا کرنے کے بعد گلے میں کوئی چیز پھر سے پھنسنے لگتی۔

اس سارے دوران اُمیش خاموش بیٹھا رہا۔ داؤد نے اپنے حساب سے بات پوری کر لینے کے بعد جیب سے رومال نکالا اور پیشانی پر سے پسینہ پونچھنے لگا لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں اُمیش کو شبہ نہ ہو جائے اُس نے رومال پورے چہرے اور گردن پر بھی پھیرا۔ اُمیش نے کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔

تھوڑی دیر بعد داؤد چائے بھی بنا لایا۔ دونوں نے چائے پی۔ دُنیا جہان کی باتیں کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی بات آگے بڑھنے کا نام ہی نہ لیتی۔ جانے کیسے اُن کے جملے اتنے سیدھے اور سپاٹ ہو گئے تھے کہ اُنہیں قواعد کی کتاب میں جگہ دی جا سکتی تھی۔ دو چار مرتبہ دونوں نے اپنے اپنے طریقے سے باتوں میں کلی پھندنے جوڑے کہ ذرا سی ہنسی ہی آ جائے لیکن ہنسی تو دُور کی بات مسکراہٹ بھی مہربان نہ ہوئی۔ آخر دل ہی

دل میں دونوں نے ہار مان لی۔

واپس جانے کے لیے اُمیش اُٹھا تو باہر تک رُخصت کرنے کے لیے داؤد بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

اُس نے ایک بار بھی نہیں کہا ''ارے بیٹھو، دس منٹ بعد چلے جانا''۔

اُمیش بھی اپنی عادت کے برخلاف جانے کے لیے فوراً ہی تیار ہو گیا۔ یہ نہیں کہ بار بار ''بس اب چلا'' کہنے کے باوجود اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہو۔

سڑک کے کنارے اُس کی گاڑی دیکھ کر داؤد کو حیرت ہوئی۔ کالونی کی تین گلیاں چھوڑ کر چوتھی ہی میں تو اُس کا مکان تھا، بالکل شروع ہی میں۔ ایک فرلانگ بھی نہ ہوگا۔ کہیں اور جانے کا پروگرام ہو تو بات دوسری ہے ورنہ اُمیش ہمیشہ پیدل ہی آتا تھا، ٹہلتا ہوا۔ آج اُسے کار سے آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اُس نے سوچا۔ یہ بھی نہیں کہ کسی اور دوست کے یہاں سے ہو کر آیا ہو۔ ورنہ اِس کا ذکر ضرور کرتا۔ جو اُس کے دوست ہیں وہ میرے بھی ہیں۔ لیکن یہ بات اُس نے بس سوچی، کہی نہیں۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اُمیش نے صرف ایک جملہ کہا۔

''میرے ہی گھر پہنچا دیتے''

''وہ۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔کیوں نہیں''

داؤد بالکل بھول گیا تھا کہ اُس نے کیا بہانہ بنایا تھا۔

اُمیش نے اپنے دوست کی گھبراہٹ بھانپ تو لی لیکن بس مسکرا کر رہ گیا۔

داؤد کو اُس کی یہ مسکراہٹ اچھی نہ لگی اور اُسے ہاتھ ہلا کر ''ٹاٹا'' کہنا بھی یاد نہ رہا۔ خاموش کھڑا گاڑی کو دیکھتا رہ گیا جو دو تین منٹ میں چوتھی گلی میں مڑ گئی۔

تیسرے دن حالات یکایک خراب ہو گئے۔ چاروں طرف سے طرح طرح کے نعروں کی آوازیں آتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایسا لگا جیسے پاس میں کہیں فائرنگ ہوئی ہے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ روبینہ تھی۔ اُس نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ

پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن اُسے خود اپنے الفاظ جھوٹ بولتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اپنی آواز میں، بلکہ اپنے آپ میں، تھوڑا سا بھروسہ شامل کر کے وہ یہی بات دوسرے لفظوں میں دہرانے جا رہا تھا کہ ٹیلی فون کٹ گیا۔ ''ہیلو، ہیلو'' اُس نے دو تین بار کہا لیکن کوئی جواب نہ ملا تو اُس نے ریسیور رکھ دیا اور گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ سوچتا رہا۔ کئی منٹ ہو گئے، گھنٹی نہیں بجی۔۔۔۔ اُس نے روبینہ کے گھر کا نمبر ملایا۔ ٹیلی فون نے 'ہاں ہوں' بھی نہ کی تو اُسے اندازہ ہو گیا کہ اب اُس کے سامنے جو پتھر رکھا ہوا ہے وہ پلاسٹک کا چھوٹا سا کھلونا بن چکا ہے۔ اُس کی نبض بھی نہیں مل رہی تھی۔

کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر اُس نے باہر جھانکا لیکن وہاں اندھیرے اور سناٹے کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ روشنی کی کوئی کرن کسی مکان سے جھانک تاک نہیں کر رہی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے سب لوگوں نے اپنے اپنے مکانوں کی اندھیری کوٹھریوں اور کونوں کھدروں کا سارا اندھیرا اس امید میں باہر پھینک دیا ہے کہ جگہ خالی ہو گئی تو اُس میں روشنی شاید اپنا گھر بنا لے گی۔ لیکن ہوا یہ کہ گھر اور باہر ایک سے ہو گئے۔ معلوم نہیں سچ مچ ایسا تھا یا اُس کی آنکھیں اندھیروں سے اتنی بھر گئی تھیں کہ اُن میں کسی دوسرے کے دل کی روشنی بھی داخل نہیں ہونے پا رہی تھی۔

سارے ہی مکان یہ سوچ کر ہر طرف سے بند کر لیے گئے تھے کہ اس طرح وہ قلعے ہو جائیں گے اور کوئی بھی اُن میں داخل نہ ہو سکے گا۔ لیکن کوئی باہر نکل بھی تو نہ سکے گا، کسی کو اس کا خیال تک نہ آیا تھا۔

نعروں اور گولیوں کی آوازیں تھمیں تو اُس نے سوچا اُمیش سے مل آئے۔ اُس کا گھر سڑک کے قریب ہے۔ وہاں شاید پتہ چل جائے کہ گولی کس نے چلائی تھی، پولیس نے یا فسادیوں نے، ایک، دوسرے پر۔ یہ معلوم ہو جائے کہ کرفیو لگا دیا گیا ہے تو رات میں شاید نیند آ جائے۔

اُسے یاد تھا کہ بیوی بچوں کے جانے کے وقت اُن سب نے مل کر ایک ایک دروازے اور ایک ایک کھڑکی کو خوب اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا، سٹکنیوں اور بیلنوں پر

ہاتھ پھیر پھیر کے، تالے ہلا ہلا کے۔ پھر بھی اُس نے دوبارہ اطمینان کرلیا۔ ان تین دنوں میں وہ گھر سے ذرا سی دیر کے لیے بھی باہر نہ نکلا تھا۔

عام دنوں میں گھر کے سارے لوگ چار چھے گھنٹے کے لیے کہیں جاتے یا رات کا شو دیکھنے نکلتے تو بھی بس باہر کے دروازے میں تالا ڈالتے اور اندر کی گرل یوں ہی چھوڑ دیتے۔ لیکن آج اس نے گرل کے بیلن والے کنڈے میں تالا ڈالنے کے علاوہ لمبی سی چابی سے وہ قفل بھی لگا دیا تھا جو لوہے کے دروازے کا حصّہ بنا دیا جاتا ہے۔

کسی نے کبھی اُسے بتایا تھا کہ دو چار دن کے لیے کہیں باہر جانا ہو یا دیر رات گئے تک باہر رہنے کا ارادہ ہو تو گھر کے اندر کا ایک ایسا بلب جلتا ہوا ضرور چھوڑ دینا چاہیے جس کی روشنی دُور سے دکھائی دیتی ہو تاکہ باہر سے ایسا معلوم ہو کہ کوئی نہ کوئی اندر ہے ۔۔۔۔ آج اُس نے سارے بلب اور ٹیوب جلا دیے تھے تاکہ کوئی کسی طرف سے دیکھے معلوم یہی ہو کہ اندر بہت سے لوگ ہیں، نہیں تو ہر کمرے میں روشنی کیوں ہوتی۔ اُس وقت وہ بالکل ہی بھول گیا تھا کہ اُسے تھوڑی دیر قبل آس پاس کا ہر مکان اندھیرے میں اس طرح ڈوبا ہوا نظر آیا تھا کہ درازوں سے بھی روشنی کی ایک لکیر باہر نہیں نکل رہی تھی۔

کار کا بس تھوڑا سا حصّہ گیرج کے اندر تھا۔ اُسے بالکل یاد نہیں تھا کہ بیوی بچوں کو پہنچانے کے بعد واپس آنے پر اُس نے گاڑی جان بوجھ کر اس طرح کھڑی کی تھی یا یہ محض اتفاق تھا۔ بیک کرنے کے لیے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اُس کی نظریں اُس روشن دان کی طرف اُٹھ گئیں جس میں اگزاسٹ فین لگا ہوا تھا تو اُسے اندازہ ہوا کہ وہ شاید کچن کی بجلی جلانا بھول گیا ہے۔ ''کوئی بات نہیں'' اُس نے سوچا ''باقی تو ساری بجلیاں جل رہی ہیں۔'' اُس نے کار جو بس رینگ رہی تھی باہر نکالی اور پوری طرح بریک لگا کر اپنے مکان پر ایک بار نظر ڈالی۔ ٹھیک سے پتہ نہیں چلا کہ اندر کمروں کی بجلیاں جل رہی ہیں یا نہیں۔

اِس خیال سے کہ چار قدم ہی تو جانا ہے، اس نے کار کی رفتار دھیمی رکھنے کی کوشش کی، لیکن آگے نکل گیا۔ کار سے اتنی تھوڑی دُور جانے میں کتنا وقت لگتا ہے، اس

کا اُس کو اندازہ نہ تھا۔ اُس نے کار بیک کی، دوسری گلی پکڑی لیکن پھر اُسے اندازہ ہوا کہ یہ گلی بھی آگے والی ہے۔ گاڑی پھر بیک کی اور تین گلیوں کے بعد والی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کے بارے میں فیصلہ اُس نے محض اندازے سے کیا تھا کیوں کہ ساری کالونی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور ہیڈ لائٹس سے مکانوں کے باہر کے چھوٹے چھوٹے پائیں باغوں کی جھاڑیوں کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا اور یہ ساری جھاڑیاں ایک سی تھیں۔

اُس نے اندازے سے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ یہ گلی بھی کالونی کی دوسری گلیوں سے کچھ الگ نہ تھی۔ اُس نے انجن بند کیا تو اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔

اُمیش کے یہاں رات کے اندھیرے میں بھی وہ کئی بار آ چکا تھا لیکن دل کے اندر کے اندھیرے میں اُس کے یہاں آنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ یہ تو اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پکا فرش شروع ہونے کے چھ سات قدم بعد گیٹ ہے اور وہاں سے بس چار پانچ فٹ بعد ایک ذرا سا اونچا اور تھوڑا چوڑا برآمدہ۔ بس اُسی جگہ دروازہ ہے اور کھڑکی بھی۔ لیکن ابھی پکا فرش ہی نہیں شروع ہوا تھا، پھر بھی وہ دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلائے، ٹوہ ٹوہ آگے بڑھتا رہا۔ احتیاطاً ایک ہاتھ کبھی کبھی آگے بھی پھیلا دیتا۔ اس بار جو اُس نے ہاتھ آگے پھیلایا تو وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔ وہ خوش ہو گیا اور اُسے اُس وقت یہ خیال بھی نہ آیا کہ ابھی نہ پکا فرش آیا تھا اور نہ برآمدہ پر اوپر سے جھولتی ہوئی بیل نے اُس کے سر ہی کو چھوا تھا۔ ''لیکن ہے یہی جگہ'' اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''دل جب خوف سے اس طرح اُچھل رہا ہو کہ اُس کی آواز باہر تک سُنائی دے رہی ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے، سب کچھ ہو سکتا ہے''۔

اب اُس نے ٹٹول کر دروازہ تلاش کرنا شروع کر دیا لیکن دونوں ہاتھ بار بار ایک ایسی دیوار سے جو کہیں چکنی تھی کہیں کھردری ٹکراتے رہے۔ ''یہیں تو تھا دروازہ'' اُس نے سوچا لیکن اُسی وقت اُسے خیال آیا کہ یہاں نہیں، ذرا سا بائیں طرف تھا، یہاں تو کھڑکی تھی۔ لیکن کھڑکی بھی تو نہیں مل رہی ہے۔ بائیں طرف بھی دیوار تھی۔

کہاں کیا دروازہ؟ اُس نے سوچا۔ اسی جگہ تو تھا وہ دروازہ جو چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں کھلتا ہے۔ اُس کے بعد وہ کمرہ جس میں مہروترہ جی، جنہیں سب چاچا کہتے ہیں، بستر پر لیٹے رہتے ہیں، پھر رسوئی اور اُس کے بعد اُمیش کی چھوٹی بہن کا پڑھائی کا کمرہ۔

اُمیش کی چھوٹی بہن کا خیال آتے ہی اسے وہ بات یاد آ گئی جو ہمیشہ ہی یاد آ جاتی تھی اور اُسے ہنسی آ گئی، بس ہلکی سی۔ لیکن یہ ہنسی اُسے بہت اچھی لگی۔ شاید کئی دنوں بعد وہ پہلی بار ہنسا تھا۔

ہنسی کی بات یہ تھی کہ اُمیش کی چھوٹی بہن جس کا نام شوبھنا تھا، ہولی دیوالی یا اپنے جنم دن پر داؤد سے تحفہ لیتے ہوئے ہر بار کہتی ''یہ تو پچھلی بار کا ہوا، آج کا کہاں ہے'' اور یہ جملہ اُس کی پہچان بن گیا تھا، چڑھی اور روٹھی ہوئی ہو تو اُسے ہنسانے کا ذریعہ بھی جس کا استعمال ماتا جی تو کرتی ہی رہتی تھیں لیکن کبھی کبھی اُمیش تک اس سے کام لیتا، اُسے چڑانے یا روٹھی ہو تو منانے کے لیے۔

اُس نے دونوں ہاتھوں سے دیوار ایک بار پھر ٹٹولی لیکن دروازہ یا کھڑکی تو دُور کی بات وہاں کوئی موکھا بھی نہ تھا۔ اُس نے سوچا اُمیش کو پکارے، ایک بار آواز لگائی بھی لیکن پھر یہ سوچ کر دوبارہ کوشش نہ کی کہ آواز دیوار سے چھن کر اندر تو جانے سے رہی۔ اور یہ بھی ڈر تھا کہ ایسے سناٹے میں آواز دُور دُور تک جائے گی اور جب دلوں میں خوف سمایا ہو تو! ذرا سے فاصلے پر بھی اُسے کچھ کا کچھ بھی سمجھا جا سکتا ہے، حالات خراب ہیں ہی۔

آواز دے یا نہ دے، دس بیس قدم اِدھر اُدھر وہ اُمیش کے مکان کا دروازہ تلاش کرے یا نہ کرے۔ اسی طرح کی باتیں سوچتا وہ وہاں نہ جانے کتنی دیر کھڑا رہا اور نہ جانے کتنی دیر اور کھڑا رہتا اگر بڑے چوراہے کی طرف سے آنے والی آوازوں نے اسے گھبرا نہ دیا ہوتا۔

کار تک واپس پہنچنے میں تو اُسے خاصی دیر لگی لیکن اسٹیرنگ وھیل کے سامنے بیٹھنے اور ہیڈ لائٹس آن کرنے کے بعد مشکل سے دو تین منٹ میں وہ اپنے گھر پہنچ گیا۔

عالم یہاں بھی وہی تھا۔ نہ کوئی روشنی اس طرف، نہ کوئی روشنی اُس طرف۔

تالا کھولنے کے دوران اُسے ایسا لگا جیسے گھر کے پیچھے کے میدان سے ہلکی سی روشنی آ رہی ہے۔ روشنی کیا آ رہی ہے۔ بس جیسے روشنی کا ہلکا سا عکس گیلری کے امرود کے درخت کے پتوں پر ذرا سی دیر کو چمکا ہو۔ یہ کچن کی روشنی تو ہو نہیں سکتی کیوں کہ کار نکالتے وقت اُس نے دیکھا تھا اور وہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اُس نے چابی لگانے کی کوشش چھوڑ دی اور ٹٹولتے ٹٹولتے گیلری کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ایک ایک چپے اور معمولی سے معمولی اونچائی نیچائی سے خوب اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود اُسے گیلری تک پہنچنے میں پانچ چھ منٹ تو لگ ہی گئے۔ پیچھے کے میدان میں روشنی اب بھی تھی لیکن اب اُس کا رُخ دوسری طرف تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی کار ہے یا موٹر سائیکل یا پھر کوئی شخص ہے جو ہنڈا لیے ہوئے ہے اور تیزی سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ اُسے دروازے تک واپس آنے میں دیر نہ لگی۔ پہلے اُس نے جلدی جلدی باہر کے دونوں دروازوں کے تینوں تالے کھولے، پھر پیچھے کا دروازہ کھولا اور اندھیرے میں ہی تیز تیز قدموں سے زینے کی جانی پہچانی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ ہر کام شتابی سے کرنے کے باوجود اُسے چھت تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ وقت لگ ہی گیا۔ اب وہاں روشنی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اُس کی سانسیں اوپر نیچے ہو رہی تھیں اور یہ حالت اُس وقت بھی قائم تھی جب وہ کسی نہ کسی طرح اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر دراز ہو گیا تھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے''؟ اُس نے سوچا لیکن پھر وہ سب کچھ بھول کر اپنی سانسیں برابر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور نہ جانے کب اُسے نیند آ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو اُس نے دیکھا کہ دروازوں، کھڑکیوں اور اُن پر دبیز پردوں کے باوجود کمرے میں سورج کی روشنی بھری ہوئی تھی۔ اُسی وقت دودھ والے کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا اور کمرے سے نکلتے ہی یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سامنے اور پیچھے کے دروازے پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے ہیں۔ اُس نے چاروں طرف

نظر دوڑائی اور اطمینان کا سانس لیا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر موجود تھی اور وہ خود بھی۔

''بھیا دروازہ کھلا پڑا تھا، اور باہر کا گیٹ بھی''۔ دودھ والے نے کہا۔

''ہوں، آج اصل میں میں بہت سویرے اُٹھ گیا تھا، پھر ذرا سا لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔''

کئی ہفتوں بعد روبینہ نے ڈرائنگ روم میں چائے بناتے ہوئے دونوں کا مذاق اُڑایا۔ ''یہ آپ لوگ ایک دوسرے کے مکان کے پیچھے کیوں پہنچ گئے تھے۔ کیا ایک دوسرے کا سامنا کرتے شرم آ رہی تھی؟''۔

■ ■

ایک سی صورتیں

ڈھائی گھنٹے ہو چکے تھے اور میکو کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ رتن منی جی نے پریشان ہونا تو بہت پہلے سے شروع کر دیا تھا، جب اُس کے لوٹ آنے کا وقت بھی نہیں ہوا تھا لیکن اب تو ڈھائی گھنٹے بھی پورے ہو چکے تھے۔ اُن کی پریشانی بلا سبب بھی نہیں تھی۔ پچاس ہزار روپوں کا معاملہ تھا اور اِس کے علاوہ بھی بہت کچھ اونچ نیچ ممکن تھی۔ وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر گیلری میں لفٹ کے تھوڑے آگے تک دھیرے دھیرے ٹہلنے لگے تھے اور اب اس طرح ٹہلتے ہوئے بھی اُنہیں آٹھ دس منٹ تو ہو ہی گئے ہوں گے۔ اِس دوران کئی لوگ لفٹ سے نکل کر اپنے اپنے فلیٹوں کی طرف جا چکے تھے اور کچھ باہر بھی گئے تھے۔ ایک آدھ نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیے تھے۔ اگر چہ اُن کی مسکراہٹ میں تھوڑی سی کھسیاہٹ شامل تھی لیکن اُنہیں یہ بھی یقین تھا کہ کسی کو اِس کا اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔

اتنے میں شیام بابو لفٹ سے نکلے اور اُنہیں کرتے پئے جامے میں دیکھ کر بولے "رتن جی خالی ہوں تو آیئے تھوڑی سی گپ شپ ہو جائے۔"

''جی نمستے، نمستے جی'' وہ اس قدر اُلجھے ہوئے تھے کہ جواب دیتے دیتے ایک لمحہ کو شیام بابو کی تجویز اُن کے ذہن سے بالکل غائب ہو گئی لیکن فوراً ہی اُنہیں سب کچھ یاد آ گیا اور اُنہوں نے بات سنبھالی ''جی بہت بہت دھنیواد۔۔۔۔۔ پھر کسی دن آؤں گا۔ آج کوئی آنے والا ہے''

بات جھوٹ بھی نہ تھی۔ کوئی نہ کوئی تو آنے والا تھا ہی اور وہ اُس کا انتظار کر بھی رہے تھے۔ ویسے شیام بابو نے گپ شپ کرنے کا سچ مچ کا نیوتا تھوڑی دیا تھا۔ وہ تو بس کچھ نہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ کچھ اور نہ سوجھا تو اُنہوں نے گپ شپ کی بات کہہ دی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اُنہیں اپنی آواز سُن کر ہی پتا چلا تھا کہ اُن کے مُنہ سے کیا نکل گیا ہے۔

رتن منی جی نے ایک بار پھر خود کو سمجھایا۔ بیکار پریشان ہو رہے ہو، میکو ایسا نہیں ہے۔ چھے سال تو مجھے ہی ہو گئے ''کا سماس'' میں۔ بہت سے لوگ تو ساڑھے چھے سال سے رہ رہے ہیں، جب یہ سارے فلیٹ بنے تھے۔ کسی نے اُس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات کبھی نہیں کہی۔ اُنہوں نے اپنے آپ سے کہا اور پھر چوروں کی طرح کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ سوئی دس منٹ آگے کھسک گئی تھی۔

اُسی وقت اُن کی نظر اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر جاتے ہوئے لفٹ کے موٹے موٹے تاروں پر پڑی تو اُن کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ''وہی ہوگا'' وہ بُدبُدائے، لیکن لفٹ رُکی اور اُس کا دروازہ پورا کھلا بھی نہیں تھا کہ اُن کی نظر ہلکے نیلے رنگ کی شیروانی پر پڑی تو وہ سمجھ گئے کہ مجاور صاحب ہیں، جن سے اُن کی گاڑھی چھنتی ہے۔ لیکن اس وقت اُن کی حالت کچھ اور ہی تھی اور محض اس خیال سے کہ مجاور صاحب اُنہیں دیکھ کر باتیں نہ کرنے لگیں وہ دوسری جانب کے فلیٹ کی طرف اس طرح لپکے جیسے کسی ضروری کام سے جا رہے ہوں۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ مجاور صاحب کی نظر اُن پر نہیں پڑی ورنہ بالکل ممکن تھا کہ وہ اُنہیں آواز دے کر بلا لیتے۔

انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن اطمینان کہاں؟ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا، چنانچہ اُنہوں نے میکو کی عادتوں کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ کسی طرح تو

وقت کٹے۔ اُنھوں نے سوچا۔

میکو کو آواز دی جائے اور وہ آس پاس ہو تو ''جی شاب'' کہہ کر اپنی لمبی سی گردن ذرا آگے کو جھکا کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ پھر اس طرح کہ اُس نے ''جی شاب'' نہ کہا ہو تو بھی آپ سمجھیں گے کہ اُس نے یہی کہا ہوگا، آپ شاید سن نہ سکے۔ لیکن اس بات سے اُنھیں اطمینان نہیں ہوا کیوں کہ سارے ہی نوکر اسی طرح یا اس سے ملتے جلتے انداز میں مالکوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے دوسری بات سوچنا شروع کر دی۔

اُنھیں خوب اچھی طرح یاد تھا کہ اُنھوں نے اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے کے پہلے ہی دن اُسے دیکھا تھا، چھے سال پہلے۔ ان سارے برسوں میں اُنھوں نے اُس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سُنی تھی۔ یہ سوچ کر اُنھیں کچھ اطمینان ہوا۔ اُسی وقت اُنھیں خیال آیا کہ اس دوران چھے بار ہولی کا تہوار آیا اور اتنی ہی بار دیوالی کا، لیکن اُنھوں نے اُسے ایک بار بھی کچھ نہیں دیا اور ہر بار یہ کام اگلے تہوار کے لیے ٹالتے رہے۔ اُنھیں دُکھ ہوا لیکن اپنے دل کا بوجھ کم کرنے کے لیے اُنھوں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ کسی اور کو بھی تو ان موقعوں پر اُسے انعام دیتے ہوئے نہیں دیکھا، نہ اِس کے بارے میں سُنا۔ ہر مہینے چالیس روپے تو دیے جاتے ہیں، کیا یہ کافی نہیں۔ پھر اُنھوں نے حساب لگایا تو یہ رقم ڈیڑھ ہزار روپے مہینے سے زیادہ ہو گئی۔ اور تقریباً ہر ایک کا اپنا نوکر بھی تو ہے، اُس کا کام ہی کیا ہے؟ بس جس دن کسی گھر کا نوکر چھٹی پر ہوتا ہے یا کام پر نہیں آتا، اُس پر تھوڑا سا بوجھ پڑ جاتا ہے، جبھی تو کوئی اُس کے بارے میں سوچتا نہیں۔ لیکن اُنھیں یہ بھی خیال آیا کہ ہر فلیٹ کا نوکر مہینے میں ایک ایک دن بھی غائب ہو جائے تو اُس پر کام کا بہت بوجھ پڑ جاتا ہوگا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی وجہ سے ہر ایک کو ایک قسم کا اطمینان رہتا ہے کہ کوئی نہ بھی ہو تو کام رُکے گا نہیں اور یہ کہ کوئی کام ہو، اُسے کہیں بھیجنا ہو، وہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ انکار کرنا تو اُس نے سیکھا ہی نہیں اور ہر کام جھٹ پٹ کر دیتا ہے۔

اُس کے بارے میں جو کچھ بھی اُنھیں معلوم تھا اُنھوں نے دل ہی دل میں

دہرالیا۔ اس میں پانچ چھے منٹ لگ گئے کیوں کہ وقت کاٹنے کے لیے انہوں نے دھیرے دھیرے سوچا تھا۔ اسی وقت انہیں اس کی ایک اور بات یاد آ گئی۔ کوئی پوچھتا ہے کتنی دیر میں لوٹ آؤ گے تو جواب دینے کے بجائے ایسے دیکھنے لگتا ہے جیسے پوچھ رہا ہو "ہم شاب؟" اور جب کام اُسے بتا دیا جاتا ہے تو وہ خود سے کچھ کہنے کے بجائے سر جھکائے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کے پوروں کو دوسرے ہاتھ کی انگوٹھے کے پاس والی انگلی سے چھو چھو کر کچھ بُدبُداتا ہے جیسے گنتی کر رہا ہو۔ "حساب لگا لیا میکو؟" پوچھنے پر وہ ایسی نظروں سے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو "بس ذرا دیر رُک جائیے شاب" اور پھر تقریباً فوراً ہی سر کو ذرا اوپر کر کے کہتا ہے "پونے دو گھنٹے لگیں گے شاب۔ دس منٹ گھاتے کے رکھ لیجیے"۔

ایسا نہیں کہ اُس کا حساب، پونے دو گھنٹے پر ہمیشہ ہی ختم ہوتا ہو۔ یہ تو کام کام پر ہوتا ہے۔ کتنی دُور جانا ہے، کتنی بار بسیں بدلنا پڑیں گی اور وہاں رُکنا پڑے گا یا پھر بس کچھ دے کر آ جانا ہے۔ یہی سب اُس کام کے سلسلے میں ہوا تھا۔ لیکن ایسا نہیں کہ اُسے حساب کتاب کی ہمیشہ ہی ضرورت پڑتی ہو۔ ایسے کاموں میں جیسے مجاور صاحب کو معلوم کرنا ہو کہ پولیس لائنس کی مسجد میں عید کی نماز کتنے بجے ہوگی یا منشی لبھو رام کی ارتھی کَے بجے اُٹھے گی، وہ کبھی حساب نہیں لگاتا۔ جتنی دیر حساب لگانے میں لگے گی اتنی دیر میں تو وہ لوٹ آئے گا۔۔۔ مسجد مشکل سے ڈھائی تین سو گز دُور ہے اور لبھو رام جی کا مکان سڑک کے اُس پار کی دوسری گلی میں تھوڑا سا اندر چل کر۔

وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن باتوں کو جو شاید سب کو معلوم ہیں دل ہی دل میں دہرانے اور کبھی کبھی بُدبُدانے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ انہیں یاد کر لینا چاہتے ہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح وقت کٹ جائے لیکن انہیں اندر ہی اندر ایک دُکھ اور بھی تھا کہ وہ اتنے پریشان ہیں اور گھر میں کسی نے ایک بار پوچھا بھی نہیں کہ بات کیا ہے اور وہ ڈرائنگ روم سے اُٹھ کر بار بار گیلری میں ٹہلنے کیوں لگتے ہیں۔ اُسی وقت انہیں ایک اور خیال آیا اور وہ مسکرا دیے۔

بات مسکرانے کی تھی بھی۔ خیال اُنہیں یہ آیا تھا کہ یہ بات بھی اُنہوں نے وقت کاٹنے کے لیے تو نہیں سوچی۔ رتن مُنّی جی نے وقت معلوم کرنے کے لیے کف اوپر کھسکایا تو اُس کا ایک سرا گھڑی کے نیچے دب گیا۔ اُنہوں نے کف برابر نہیں کیا اور گھڑی بھی نہیں دیکھی۔ ایک دم اُنہیں محسوس ہوا کہ وہ بیکار کی باتیں سوچ کر خواہ مخواہ وقت برباد کر رہے ہیں۔ بھلا عید کی نماز کا وقت اور ارتھی کے بیچ اُٹھ جانے کا، معلوم کرنے کا میکو کی واپسی میں اس قدر دیر ہو جانے سے کیا تعلق؟ اُنہیں یہ سوچ کر تھوڑی سی خوشی تو ہوئی کہ وہ وقت کی قدر کرتے ہیں لیکن اس کے بجائے کیا کیا جائے یہ اُن کی سمجھ میں نہیں آیا۔

اُنہیں اپنی یادداشت پر کچھ کچھ شک ہوا۔ میکو نے سوا دو نہیں بلکہ سوا تین گھنٹے میں واپس آنے کا حساب لگایا تھا۔ دُور بھی تو کتنا ہے۔ اُنہوں نے سوچا، اتنی جلدی کیسے آ جائے گا؟ لیکن اُنہیں یاد آیا کہ بات پکّی کرنے کے لیے جب وہ شرٹ اور پینٹ کے بجائے ململ کا کرتا اور سفید بھک پے جامہ پہن، کندھے پر سبز رومال ڈال اور جالی دار گول ٹوپی اُوڑھ کر اپنے سالے کے مکان سے ایک دوست کی کار میں تقریباً اسی قدر فاصلے سے سکینہ جی کے یہاں گئے تھے تو بس ڈیڑھ گھنٹے لگے تھے۔ لیکن کار اور بس کا کیا مقابلہ؟ اُنہوں نے خود کو سمجھایا۔ اُسے تو دو بسیں بدلنا پڑیں گی اور ضروری نہیں کہ بس وقت پر آ ہی جائے اور اگر آ بھی گئی تو اپنے وقت پر آئے گی، مسافروں کو دیکھ کر تو وہ چلتی نہیں۔ اس کے علاوہ پیدل بھی تو چلنا ہوگا۔ رکشے اُس علاقے میں مشکل سے ملتے ہیں اور آٹو رکشے کے حساب سے روپے اُنہوں نے دیے نہیں تھے۔ اُنھیں اپنی کنجوسی پر افسوس ہوا۔ دس دس کے تین نوٹوں کے بجائے اگر اُنہوں نے پورے پچاس روپے دے دیے ہوتے تو وہ اب تک کب کا واپس آ چکا ہوتا۔ ایسا نہیں کہ اُنہیں اس کا خیال نہ آیا ہو، بلکہ اُنہوں نے ایک بار تو یہ تک سوچا تھا کہ اُسے سٹی بس کے چکّر میں ڈالنے کے بجائے ''کاسماس'' کے باہر سے ہی آٹو رکشہ پکڑنے کے لیے کہہ دیں لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ اُنہوں نے اُسے گن کر دس کے تین ہی نوٹ دے دیے تھے۔ اب وہ اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے لیکن اُنھیں ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اُس سے دوسری

بس سے اتر کر آٹو رکشہ کر لینے کے لیے نہ کہنے پر افسوس کر رہے تھے یا اُس تیز سواری پر سید ھے سکسینہ جی کے یہاں نہ بھیجنے پر۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا لیکن اب تو اُسے آ ہی جانا چاہیے، پھر بھی اپنی بے چینی پر ذرا سی لگام لگانے کی کوشش کی اُنہوں نے۔

اب وہ گیلری میں ٹہلتے ٹہلتے کسی قدر تھک گئے تھے۔ یہاں ٹہلنے سے بس اتنا فائدہ ہوگا کہ وہ مکیو کو منٹ آدھے منٹ پہلے دیکھ لیں گے، اُنہوں نے سوچا اور اُس کے فائدے نقصان کو تولے بغیر ڈرائنگ روم میں جا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں نوکرانی نے آ کر پوچھا ''صاحب کھانا تیار ہے، لگا دیا جائے؟''

بھوک تو اُنہیں لگ رہی تھی لیکن میکو کے انتظار میں اُس کا کوئی خاص احساس نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی اُنہوں نے سوچا کہ وہ آ جائے تو اطمینان سے کھانا کھایا جائے، ابھی تو کھاتے بھی نہیں بنے گا۔ چنانچہ اُنہوں نے نوکرانی سے جو پردے سے پیٹھ لگائے کھڑی تھی کہہ دیا ''ابھی نہیں۔ مالکن سے کہہ دو دس پندرہ منٹ بعد کھانا لگوائیں''۔

یہ بات کہنے کو تو اُنہوں نے کہہ دی لیکن پھر سوچنے لگے کہ کھانے کی میز پر بیوی بچوں کی باتوں میں کچھ وقت کٹ جاتا اور وہ اپنی یہ اُلجھن تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتے، لیکن اب تو نوکرانی نے مالکن تک بات پہنچا بھی دی ہوگی۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے، اُنہوں نے سوچا، کہ کسی ایسی بات پر جسے سُن کر ہنسنا چاہیے وہ نہ ہنستے تو بچے اور اُن سے زیادہ بیوی سوچتی کہ وہ کسی معاملے میں پریشان ہیں اور پریشانی کی باتیں تو لگی ہی رہتی ہیں، کبھی انکم ٹیکس کی پریشانی ہوتی ہے اور کبھی گنا کسانوں کو یکمشت ادائگیاں کرنے کی۔

اُسی وقت اُنہیں خیال آیا کہ اِس کام کے لیے آفس کا چپراسی یا کوئی دوسرا ملازم بہتر رہتا لیکن اُس میں ایک خطرہ یہ تھا کہ گنا کمشنر کو اتنی بڑی رقم بھیجنے کی بات پھیل بھی سکتی تھی اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کسی نازک موقع پر وہ یہ راز جان بوجھ کر دوسروں کو بتا دیتا۔ ویسے، وہ سکسینہ بابو کو فون کر دیتے کہ اُن کی چیز تیار ہے کسی سے منگا لیں تو اِس وقت جس اُلجھن میں وہ گرفتار ہیں اس کی نوبت نہ آتی۔ لیکن آج کل کرپشن کے بہت سے معاملے پکڑے گئے ہیں، ایک معاملے میں تو اُن کا نام بھی سدن میں آ چکا ہے۔

کون جانے اُن کا ٹیلی فون سُنا جاتا ہو اور پکڑ دھکڑ ہو جاتی تو سکینہ جی یہ بھی کر سکتے تھے کہ اپنی جان بچانے کے لیے اُنہیں پھنسا دیتے۔

غرض وہ روپے پہنچانے کا جو بھی دوسرا طریقہ سوچتے اُس میں زیادہ ہی بڑا خطرہ نظر آتا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے، اُنہوں نے فیصلہ کن انداز میں سوچا کہ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا اور یہی طریقہ ایسا تھا جس میں خطرہ سب سے کم تھا۔ مناسب ترین فیصلہ کرنے کے لیے اُنہوں نے دل ہی دل میں اپنی تعریف کی اور فخر سے سر ذرا سا اوپر اُٹھایا اور مسکرائے بھی، لیکن میکو اب تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اُسی وقت اُن کا جی چاہا کہ گیلری میں نکل کر ایک بار ذرا گیٹ کی طرف جھانک کر دیکھیں لیکن پھر یہ سوچ کر ارادہ بدل دیا کہ کوئی بُری خبر آنے والی ہو تو جتنی دیر نہ آئے اتنا ہی اچھا ہے۔

بُری خبر کی بات سوچنے کو تو اُنہوں نے سوچ لی لیکن ایسا لگا جیسے دل بیٹھا جا رہا ہو۔ یکایک اُنہیں احساس ہوا کہ صوفے کے اسپرنگ ڈھیلے پڑ گئے ہیں اور وہ اُس میں دھنسے جا رہے ہیں۔

اُسی وقت جگدیش نے دروازہ کھولا تو اُن کی نظر اُس کے چہرے کے بجائے اُن چیزوں پر پڑی جو وہ اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی ذرا موٹی پنّی تھی جس میں انڈے تھے، دوسرے ہاتھ میں دو ڈبل روٹیاں اور اُنگلی میں لٹکا ہوا ایک تھیلا جس میں شاید بچوں کے لیے ٹافیاں اور تھوڑا بہت چھٹ پٹ سامان رہا ہوگا۔ اپنے خیالوں میں وہ ایسے ڈوبے ہوئے تھے کہ اُنہوں نے اُس کی صورت نہیں دیکھی، لیکن تھا وہ جگدیش ہی۔ اس میں کوئی شک نہیں، اُنہوں نے سوچا مگر وہ میکو کی طرح تیز تیز چل رہا تھا۔ سستی سے دھیرے دھیرے کام کرنے پر تو ہر وقت اُسے ڈانٹ پڑتی رہتی ہے، آخر معاملہ کیا ہے؟ لیکن نہیں وہ جگدیش ہی تھا۔ اور کوئی بھلا اِس طرح گھر میں جا سکتا ہے؟ پھر صوفے پر سے ایک جھٹکے سے اُٹھ کر اُنہوں نے اُس دروازہ پر سے ذرا سا پردہ اُٹھا کر جس سے لابی کا وہ حصہ صاف نظر آتا ہے جس میں فِرج رکھا ہوا ہے کہا ''مالکن کہاں ہیں۔۔۔۔ ان سے کہو کھانا لگانے کو کہہ دیں۔''

سامنے جگدیش فرج کھول کر سامان رکھ رہا تھا۔ اُن پر نظر پڑتے ہی اُس نے کہا۔

''مالکن اپنے کمرے میں ہیں۔ کہے دیتا ہوں''۔

رتن منی جی یہ دیکھنے نہیں گئے تھے کہ سامان لانے والا جگدیش ہی تھا، کوئی اور نہیں، لیکن اُسے دیکھ کر جانے کیوں اُنہیں اطمینان کا احساس ہوا۔

کھانا اُنہوں نے کس طرح کھایا، یہ وہی جانتے تھے۔ بڑی پلیٹ سے چاول نکالتے ہوئے چمچا اُن کے تھال سے ٹکرایا تو اُنہوں نے جگدیش کی طرف دیکھا۔ وہ اُن کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اُس کے دل کی بات رکھنے کے لیے اُنہوں نے کہا۔

''ذرا دیکھ لینا باہر کا دروزہ بند ہے نا؟''

مشکل سے دس پندرہ سیکنڈ کے بعد اُس نے کہا ''بند ہے''

یہ اُنہیں معلوم تھا اور یاد تھا کہ گیلری سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے وقت اُنہوں نے سٹکنی چڑھا دی تھی۔ پھر اُنہوں نے جگدیش سے دروازہ دیکھ آنے کو کیوں کہا تھا۔ اُنہوں نے یہ بات اُس کا دل رکھنے کے لیے کہی تھی یا اس خیال سے اُسے بھیجا تھا کہ وہ قدموں کی چاپ سُنے گا تو دروازہ کھول کے دیکھے گا ضرور اور میکو واپس آیا ہوگا تو اُن کے بارے میں پوچھے گا ہی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔

اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بڑے بیٹے نے جو بارہ تیرہ سال کا تھا، جب تک ''رانگ نمبر'' نہیں کہہ دیا، نوالہ اُن کے حلق میں اٹکا رہا۔

کھانا کھانے کے بعد۔۔۔۔۔۔ وہ تولیے سے ہاتھ پونچھ ہی رہے تھے کہ اُنہیں ایسا لگا جیسے کسی نے دروازہ دھیرے سے تھپتھپایا ہو۔ جگدیش نے ڈرائنگ روم کا رُخ کیا تو اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا اور خود جا کر دروازہ کھولا۔ ہَوا بھی شاید اُن کی اُلجھن سے مزا لینے لگی تھی۔

اپارٹمنٹ کے تقریباً سارے فلیٹوں کے مالک بڑے بڑے سرکاری افسر تھے یا

بیوپاری۔ تین چار تو ایسے تھے جن کی ملیں تھیں۔ دو ریٹائرڈ فوجی افسر تھے۔ بس پانچ ایسے خاندان تھے جو اسی جگہ کے پرانے ایک منزلہ اور دو منزلہ مکانوں میں برسوں سے رہتے آئے تھے۔ اُن ہی مکانوں اور اُن کے چاروں طرف کی زمین پر جو پہلے خالی پڑی تھی ''کاسماس'' کی تعمیر ہوئی تھی۔ شرائط اور قیمت کے سلسلے میں بات چیت کے دوران جو تقریباً سوا سال چلی تھی اور کئی بار ٹوٹتے ٹوٹتے بچی تھی، مسرکھ بابو نے بلڈر سے کہا تھا۔

''یہ مکان اور اُن کے چاروں طرف کی زمین میری ضرور ہے لیکن ان مکانوں کو خالی کرانے کے چکر میں ہرگز نہیں پڑوں گا۔ آٹھ دس لوگ جو جھگیوں اور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اُن کا قبضہ تو ظاہر ہے ناجائز ہے۔ پھر بھی میں یہ نہیں چاہوں گا کہ اُن کے ساتھ زور زبردستی ہو۔ اس لیے کچھ دے دلا کر معاملہ طے کر لیجیے گا۔ لیکن یہ کرائے دار تو میرے پتا جی کے زمانے کے ہیں بلکہ اُن میں سے ایک تو کہتے ہیں کہ اُنہوں نے کئی سال تک دادا جی کو بھی دیکھا ہے۔ دادا جی کو دیکھا ہے تو کرایے دار وہ اُنہیں کے زمانے کے ہوئے۔ اُن کے سر چھپانے کا تو انتظام کرنا ہی پڑے گا''۔

بلڈر نے اُن کی بات مان لی تھی بلکہ یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اُن چاروں پانچوں کے لیے ایک ایک فلیٹ کا وہ انتظام ضرور کرے گا۔ قیمت بھی کچھ کم ہو جائے گی اور اگر ان کے لیے فوراً فلیٹ خریدنا ممکن نہ ہو تو واجبی کرائے پر بھی دو تین سال رہ سکتے ہیں۔''

بلڈر نے مسرکھ بابو کے چہرے پر اُن کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لیے نظریں گڑا دی تھیں۔ اُس کو اندازہ ہوا کہ اُنہیں نہ صرف یہ کہ اُس کی پیش کش منظور ہے بلکہ وہ خاصے مطمئن بھی ہیں تو اُس نے پوری بات کہہ دی جو سوچی تو اُس نے پہلے تھی لیکن کہی اس خیال سے نہیں تھی کہ وہ ذرا خوش ہو جائیں تو اپنی شرطیں بھی اُنہیں بتا دے۔

''ہم کوئی آپ سے باہر تھوڑی ہیں۔ آپ کو اُن کا خیال ہے تو ہمیں بھی اُن کا کچھ کم خیال نہیں۔ چوتھی منزل کے پانچ فلیٹ بس انہیں کے سمجھیے، اُدھر ہوا بھی خوب آئے گی اور کوئی پریشانی بھی نہ ہوگی۔ لفٹ تو ہوگی ہی، نیچے والے فلیٹ تو وہ لوگ پسند کرتے ہیں جن کے یہاں بڈھے لوگ زیادہ ہوتے ہیں اور یہ کہ کرایے میں رعایت

کے لیے دو سال بہت کافی ہوں گے۔ دیکھیے گا وہ فلیٹ اُس سے پہلے ہی خرید لیں گے۔ اس خیال سے کہ ایک کام پورا ہو تو دوسرے میں ہاتھ ڈالا جائے۔ ہم فائدہ کھانے میں نمک کے برابر رکھتے ہیں''۔ بلڈر نے کہا تھا۔

اتنی لمبی بات اُس نے دھیرے دھیرے، رُک رُک کر کہی تھی جس سے وقت بھی زیادہ لگا تھا اور مسرکھ بابو کو احساس بھی نہیں ہوا کہ شرطیں رکھی جا رہی ہیں۔ اُنہیں یہی لگا کہ وہ منظوری کی بات بس دوسرے لفظوں میں کہہ رہا ہے۔ اُنہیں یہ جان کر بھی خوشی ہوئی تھی کہ بلڈر نے کامپلیکس کا پورا نقشہ بھی بنا لیا ہے، جس کے معنی تھے کہ زمین خریدنے کا اُس نے پکّا ارادہ کر لیا ہے۔ اُس وقت اُنہیں روپوں کی ضرورت بھی تھی۔

اتفاق سے اُسی وقت میکو سامنے سے گزرا تو مسرکھ بابو کو ایک بات اور سوجھ گئی۔

''اور یہ جو میکو ہے'' اُنہوں نے گلا صاف کرنے کے لیے کھنکھارا ''یہ بھی پتا جی کے زمانے سے، بلکہ شاید تب سے ہے جب دادا جی جیوت تھے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہتا ہے۔ غریب کہاں جائے گا۔ اُسے ایک کوٹھری دینا ہی ہوگی اور کرایہ بھی نہیں لگے گا''۔

اُن کی یہ نئی شرط سن کر بلڈر اور اُس کا ساتھی ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے تھے جیسے اُنہوں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جسے پورا کرنا اُن کے لیے ناممکن ہو۔

''یہ تو جیادتی ہے صاحب'' بلڈر نے کہا تھا۔ اِس کام کے لیے تو ہمیں سارا نقشہ پھر سے بنوانا پڑے گا۔ ایک کوٹھری بھی بڑھائی جائے تو ایک فلیٹ نکل جاتا ہے۔ ویسے ہم چوکیدار رکھیں گے ہی۔ اُن میں آپ کے آدمی کو بھی کھپا دیں گے لیکن الگ سے کوٹھری دینے کے لیے نہ کہیے، ہمیں بھی چار پیسے کما لینے دیجیے''۔

مسرکھ بابو نے، جن کی ہمت بڑھ چکی تھی، سوچا کہ جب نقشہ تک بن چکا ہے تو اب وہ جائے گا کہاں، اِس لیے اُنہوں نے لہجہ تو نرم ہی رکھا لیکن مضبوطی سے اپنی بات پر اڑے رہے۔ ''اِس میں مشکل کیا ہوگی؟ اتنی بڑی زمین ہے، سوا تئیس ہزار اسکوائر فٹ سے اوپر۔ اُس میں بارہ فٹ چوڑی، پندرہ فٹ لمبی کوٹھری کے لیے آپ جگہ نہیں

نکال سکتے؟ پتا جی تو اب ہیں نہیں''، اُنہوں نے اپنی آخری ڈھال نکالی اور پھر پھر جذباتی ہوگئے'' لیکن میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ وہ اُس کا بہت خیال کرتے تھے۔ اُس و پریشانی ہوئی تو اُن کی آتما کو دُکھ ہوگا''۔

جہاں مسرکھ بابو دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ بات اس پر ٹوٹنے لگی تو وہ جھک جائیں گے، وہیں بلدر نے بس ایک چال چلی تھی کہ یہ جھنجھٹ نہ پالنا پڑے تو اچھا ہے۔ اتنی بڑی زمین کوڑیوں کے مول مل رہی ہے، ایک کیا تین چار کوٹھریاں نکال جا سکتی ہیں لیکن ظاہر یہی کیا تھا کہ مسرکھ بابو کی بھاؤناؤں اور اُن کے پتا جی کی آتما کی شانتی کے لیے وہ اتنی بڑی قربانی دے رہا ہے اور بات پکی کر لی تھی۔

اپارٹمنٹ میں تینتالیس فلیٹ نکلے تھے، جن میں سے پانچ تو پرانے کرایے داروں کو آدھے کرایے پر دے دیے گئے تھے، باقی اڑتیس میں سے ایک مسرکھ بابو کا تھا۔ پہلی منزل پر، زیادہ تر فلیٹ بک گئے اور جو تھوڑے سے بچے تھے اُنہیں عارضی طور پر کرایے پر اُٹھا دیا گیا تھا۔ چوبیس گھنٹے پانی اور بجلی کی سپلائی، شہر کے اندر ہونے کے باوجود تین طرف درختوں سے گھرے ہونے اور مناسب داموں کی وجہ سے خریداروں کا اُسے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جو دو تین فلیٹ بچ رہے تھے، اُنہیں خریداری کا معاہدہ کر کے ایک سال کے لیے کرایے پر اُٹھا دیا گیا تھا۔ پُرانے کرایہ داروں نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ پیسوں کا انتظام کر رہے ہیں اور جیسے ہی روپے ہاتھ آگئے وہ رجسٹری کرا لیں گے۔ اُن سے طے یہ ہوا تھا کہ اُنہوں نے سوا سال یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال میں روپیوں کا سُبیتا کر لیا تو اُنہیں موجودہ قیمتوں سے کچھ کم ہی رقم دینا پڑے گی لیکن اُس کے بعد یہ سہولت نہیں ملے گی اور کرایہ داری دو سال سے زیادہ بالکل نہیں چلے گی۔ پُرانے کرایہ داروں میں سے تین نے تو مقررہ مدت سے پہلے ہی اپنے اپنے فلیٹ خرید لیے تھے البتہ باقی دو کو روپیوں کا انتظام کرنے میں دو سے ڈھائی سال تک لگ گئے تھے لیکن مسرکھ بابو کی سفارش پر اُن کو وقت گزر جانے کے باوجود فلیٹ خالی کرنے پر مجبور نہیں کیا

گیا تھا۔ اور قیمت نہ صرف بڑھائی نہیں گئی بلکہ اُس میں رعایت بھی کر دی گئی تھی۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میکو کے سلسلے میں بھی بلڈر نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا اور اُسے کوٹھری نما کمرہ مل گیا تھا جو ذرا سا چھوٹا ہونے کے باوجود اُس کے سر چھپانے کے لیے کافی تھا اور اُسے کرایہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ وہ اُس میں اپنا تالا بھی ڈال سکتا تھا۔

اپارٹمنٹ کے نئے باسیوں کو میکو سے مانوس ہونے میں دیر نہیں لگی اور لگتی بھی کیسے کیونکہ جو بھی فلیٹ دیکھنے آتا اُس کی ملاقات سب سے پہلے اُسی سے ہوتی۔ مقررہ اوقات سے پہلے یا بعد میں معلومات حاصل کرنے جو بھی آتا بلڈر کے کہنے پر وہی اُسے فلیٹ کھول کر دکھاتا اور اُس کی موجودگی میں ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ اِس لیے ایک طرح سے وہ ''کا سماس'' کا سب سے پرانا آدمی بن گیا تھا۔ اُس کے پاس بہت زیادہ کام نہ تھا کیوں کہ زیادہ تر لوگوں کے پاس اوپر کا کام کرنے کے لیے اپنے اپنے نوکر تھے لیکن یہ بھی ہوتا کہ دسویں پندرہویں کسی نہ کسی فلیٹ کا کوئی نوکر گول ہو جاتا یا کوئی نوکری چھوڑ کر چلا جاتا اور نئے نوکر کا انتظام کرنے میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ وقت لگتا ہی ہے، اِس لیے ہر کسی کو کبھی نہ کبھی اُس کی ضرورت پڑ ہی جاتی۔ چنانچہ طے یہ کیا گیا تھا کہ ہر فلیٹ سے اُسے چالیس روپے مہینے دیے جائیں گے۔ یہ روپے شروع مہینے میں مسر کھ بابو کو دے دیے جاتے اور وہ ساری رقم یکمشت اُسے دے دیتے، اُس کا کام بھی چلتا رہتا اور فلیٹ میں رہنے والوں کا بھی۔ یوں تو کوئی خاص کام اُس کے ذمے نہ تھا لیکن اُس کے ہونے اور نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے اِس کا اندازہ لوگوں کو اُس وقت ہوتا جب وہ سال میں پندرہ بیس دن کے لیے گھر چلا جاتا۔ دیس اُس کا بلاسپور تھا اور ''شاب'' کہنا اُس نے شاید نیپالی چوکیداروں سے سیکھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ ایماندار تھا اور اب تک کسی کو ایک پیسے کے ہیر پھیر کی اُس سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔

یہ سب اپنی جگہ، لیکن رتن منی جی کی پریشانی بھی ٹھیک تھی۔ ہوتے ہوتے ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے تھے اور میکو اب تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ اُس نے حساب لگا کر بتائے تو ڈھائی یا ساڑھے تین گھنٹے تھے لیکن وہ ہمیشہ ہی بتائے ہوئے وقت سے پہلے

آ جاتا تھا۔ معلوم نہیں کہاں رہ گیا؟ ہوسکتا ہے کوئی ایسی بات ہوگئی ہو جس کا پہلے سے حساب نہیں لگایا گیا ہو، اُنہوں نے اپنے آپ کو تسلّی دی۔ لیکن اُسی وقت اُنہیں خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس نے جھولا بس میں چھوڑ دیا ہو اور یاد اُسے اُس وقت آیا ہو جب بس دُور نکل گئی ہو۔ یہ سوچتے ہی اُن کے دل میں جیسے پنکھے لگ گئے۔ اُنہوں نے کھڑکی سے دیکھا کہ نسیم صاحب اپنے فلیٹ سے نکل رہے ہیں تو جلدی سے گیلری میں آ گئے۔ حسبِ دستور نسیم صاحب مسکرائے تو اُنہوں نے جواب میں مسکرانے کے بجائے کہا ''میکو کو ایک ضروری کام سے بھیجا تھا۔ ساڑھے تین گھنٹے ہو گئے، اب تک لوٹ کے نہیں آیا۔''

''کسے؟ برجو کو؟۔ بنرجی صاحب کا نوکر؟''

''نہیں نسیم صاحب، میکو، میکو جو پیچھے کوٹھری میں رہتا ہے'' اُنہوں نے رُک رُک کر کہا۔

''اچھا میکو، میں سمجھا تھا برجو۔ میکو ہے تو آتا ہی ہوگا'' نسیم صاحب نے اطمینان سے کہا اور زینے کی طرف بڑھ گئے۔

اُنہیں نسیم صاحب کی یہ بے رُخی ایک آنکھ نہ بھائی۔ اور کچھ نہ سہی، ہمدردی تو کر ہی سکتے تھے۔ اُنہوں نے سوچا لیکن پھر اُنہیں خیال آیا کہ ہمدردی کا اظہار تو اُس وقت کیا جاتا ہے جب نقصان ہو چکتا ہے۔ ''ٹھیک کیا نسیم صاحب نے، ٹھیک ہی کیا'' وہ دھیرے دھیرے بڑبڑائے ''بھگوان نہ کرے جو کسی کی ہمدردی کی مجھے ضرورت پڑے۔''

نسیم صاحب چار چھے زینے اُترنے کے بعد لوٹ آئے، شاید کچھ بھول گئے ہوں گے۔ رتن منی جی پر جیسے ہی اُن کی نظر پڑی بولے ''آپ پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ میکو تو بہت ایماندار نوکر ہے لیکن اِدھر میں نے دیکھا ہے کہ دوسرے نوکروں کے ساتھ رہ کر کچھ کچھ رنگ پکڑ رہا ہے''۔ یہ کہتے ہوئے وہ جلدی سے اپنے فلیٹ میں چلے گئے اور مشکل سے ایک ڈیڑھ منٹ میں لوٹ آئے۔ ایک چھوٹا سا کاغذ اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اُنہوں نے رتن منی جی سے کہا۔

''آپ نے گیٹ کے باہر کی گمٹی کے پاس جہاں پان کی دوکان ہے دیکھا۔

میں نے کئی بار اُسے دوسرے نوکروں کے ساتھ وہاں بیٹھے دیکھا ہے؟''

اُن کا جی چاہا کہ فوراً ہی ڈگ بھرتے ہوئے جائیں اور اُسے وہاں دیکھ آئیں لیکن پھر یہ سوچ کر کہ نسیم صاحب کیا کہیں گے، رُک گئے اور اُنہوں نے جب یہ دیکھ لیا کہ وہ گیٹ پار کر چکے ہیں تب ہی زینے کی طرف قدم بڑھایا۔ گمٹی کے بالکل پاس جانا اُنہیں اچھا نہیں لگا، اس لیے تھوڑے فاصلے سے اُنہوں نے نظریں گاڑ کے دیکھا۔ یوں تو شام اتر آئی تھی لیکن پان کی دوکان کے بلب کی روشنی اتنی ضرور تھی کہ میکو وہاں ہوتا تو اُنہیں نظر آ ہی جاتا۔ پانچ چھے گھروں کے نوکر وہاں بیٹھے تھے۔ میکو اُن میں نہیں تھا لیکن جانے کیوں بار بار اُنہیں خیال آتا رہا کہ پاس جا کر دیکھ لینا چاہیے تھا۔

رتن منی جی کو پچاس ہزار روپوں کی فکر تو تھی ہی لیکن اُس سے زیادہ پریشانی اب اُنہیں اس کی ہونے لگی تھی کہ وہ کہیں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ ٹریفک کانسٹبل ہوئے جو چوراہوں کے موڑ پر کھڑے رہتے ہیں تو ہزار پان سو لے کر چھوڑ دیں گے۔ لیکن کوئی چھوٹا موٹا افسر بھی ساتھ ہوا اور وہ بھی ایسا جو اِدھر اُدھر منہ مارنے کے بجائے خود کو ایماندار ثابت کر کے جلدی جلدی ترقی کے ذریعے اُس کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہے، تب بڑی پریشانی کھڑی ہو سکتی ہے۔ میکو ویسے ہی سیدھا سادا ہے۔ پولیس کے دو ڈنڈے کھا کر فوراً اُگل دے گا کہ روپے کس نے بھیجے تھے اور کس کو بھیجے گئے تھے۔ کین کمشنر کے دفتر کے چپراسی تک مٹھی گرمائے بغیر سیدھے مُنہ بات نہیں کرتے اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ روپے سکسینہ جی کو بھیجے جا رہے تھے تو پولیس معاملہ سی۔ آئی۔ ڈی کے سپرد بھی کر سکتی ہے اور اگر ایسا ہوا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گا۔ اپنی پریشانی میں اُنہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ غریب ہزار پان سو دے گا کہاں سے۔

روپوں کی تو کوئی بات نہیں، حساب کتاب کے اتنے روپے بلکہ اس سے زیادہ بھی تجوری میں پڑے ہی رہتے ہیں لیکن پوچھا یہ جائے گا کہ اتنے بہت سے روپے سکسینہ صاحب کو کیوں بھیجے گئے تھے۔ سی۔ آئی۔ ڈی سب کچھ کھود نکالے گی۔ ایک مہینے میں گنا کسانوں کا تین سال کا بقایا ادا کرنے کا حکم ہوا ہے اور میں نے ایک ایک

سال کا بقایا دو دو مہینے میں ادا کرنے کی مہلت مانگی ہے اور فیصلہ ظاہر ہے کمشنر صاحب کو کرنا ہے، سیدھا سیدھا رشوت کا کیس بن جائے گا۔ اُن کی پیشانی پسینے سے تر ہوگئی اور اُنہوں نے سوچا کہ اس سے اچھا تو یہی ہوگا کہ وہ جھولا بس ہی میں بھول جائے۔

لیکن پھر جیسے ایک دم اُن پر انکشاف ہوا ''پچاس ہزار روپے۔ پچاس ہزار روپے ہوتے ہیں'' اور اُن کا دل دوسری طرح کی پریشانی سے بیٹھنے لگا۔

اس پریشانی کے سارے پہلوؤں پر وہ اب تک غور کر چکے تھے لیکن کچھ اس طرح کہ ایک پہلو سے پوری طرح سوچنے سے پہلے دوسرا خیال آجاتا۔ اس لیے اُنہوں نے ایک ایک بات کو الگ کرنا شروع کیا۔ سب سے اچھا تو یہ ہوگا کہ وہ تھیلا سکینہ بابو کے یہاں پہنچا آئے، اور اگر پولیس کے ہاتھ ہی پڑنا ہو تو اس سے اچھا یہ ہوگا کہ وہ جھولا بس میں بھول جائے اور گھنٹہ بھر تک اِدھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد روتا پیٹتا لوٹ آئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اُسے کسی طرح پتہ چل گیا ہو کہ جھولے میں ضروری کاغذات کے بجائے پانچ پانچ سو کے پورے سو نوٹ ہیں اور اُس کی نیت پھسل گئی ہو۔ لیکن میکو ایسا ہے نہیں۔ سچ پوچھیے تو اُنہیں میکو کے ایماندار ہونے پر خاصا افسوس بھی ہوا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ معاملہ کے پولیس کیس بننے کا خطرہ ہو۔

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ لفٹ رُکی اور اُس میں سے میکو برآمد ہوا۔ اُنہوں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی اور اُس پر کسی قسم کی فکر یا پریشانی کا نشان تک نہ پاکر اطمینان اور خوشی کی ایک لہر اُن کے سارے بدن میں دوڑ گئی۔ لیکن اُسے وہ چھپا گئے اور جھوٹ موٹ کے غصے سے بولے۔

''کہاں رہ گیا تھا۔ اتنی دیر لگادی؟''

''کہیں نہیں شاب، ۳۷ نمبر کی بس تو میرے پہنچتے ہی سامنے سے نکل گئی اور پھر ۱۴۹ نمبر کا کناٹ پلیس میں ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔''

''صاحب مل گئے تھے؟''

''گھر پر تھے نہیں، مگر تھوڑی ہی دیر میں آگئے تھے'' میکو نے گردن جھکائے

جھکائے کہا اور قمیص کی اوپر والی جیب سے ساڑھے بارہ روپے نکال کر اُن کے ہاتھ میں رکھ دیے۔ رتن منی بابو اُس وقت اتنے خوش تھے کہ اُنہوں نے روپے واپس اُس کی جیب میں ڈال دیے اور پوچھا۔

''تو نے جھولا سکسینہ صاحب کے ہاتھ میں دیا تھا نا؟''

''ہاں شاب اُن ہی کو دیا تھا۔ وہ جھولا لیتے ہی اندر چلے گئے تھے اور مجھے روک لیا تھا''۔

''اندر سے جلدی واپس آ گئے تھے کہ دیر لگائی تھی؟'' اُنہوں نے پوچھا۔

''تھوڑی دیر میں آئے تھے اندر سے''

''روپے گن رہے ہوں گے'' اُن کے مُنہ سے نکل گیا لیکن اُنہوں نے یہ سوچ کر کہ شاید میکو سمجھا نہ ہو، جلدی سے دوسرا سوال کر دیا'' کچھ کہہ رہے تھے؟''

اُنہوں نے کہا تھا کہ آپ سے دھنیواد کہہ دوں اور میرے کو کہا تھا کسی کو بتانا نہیں تم کہاں گئے تھے۔

میکو کا دِل یہ سوچ کر اُلٹ پلٹ ہونے لگا تھا کہ اُس کے پاس اتنے بہت سے روپے تھے لیکن وہ اُس کی پریشانی بھانپ نہیں سکے تھے۔

ایک بار تو اُن کا جی چاہا کہ اندر سے ایک ہرا نوٹ لا کر اُس کو دے دیں لیکن اُنہوں نے پھر اپنا ارادہ بدل دیا اور یہ کہنے کے بجائے کہ اب جاؤ اُنہوں نے کہا'' اور سب تو ٹھیک رہا۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟

''گڑ بڑ کیشی ساب'' اصل میں وہ ''شاب'' کہنے والا تھا لیکن جلدی میں یہ نقطے ذرا پہلے لگ گئے۔''اور کوئی کام شاب؟''۔ اُس کے اس جملے کے معنی تھے کہ جب کوئی کام ہو بلا لیجیے گا۔

اُنہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آہستہ سے مسکرا دیے۔

ویسے تو اپنے فلیٹ کے علاوہ ''کا سماس'' سے مسر کھ بابو کا اب کچھ لینا دینا

نہیں تھا لیکن وہ سمجھتے اپنے آپ کو اُس کا مالک ہی تھے۔ گراؤنڈ فلور کے اپنے فلیٹ سے
جو اُنہیں مُفت میں ملا تھا ٹہلنے کے لیے نکلتے اور دوسرے فلیٹوں کے رہنے والوں کو آتے
جاتے دیکھتے تو مالکانہ شان سے دھیرے دھیرے چلنے لگتے۔ یہ تو ہر ایک کو معلوم تھا کہ
ساری زمین کبھی اُن کی ہوتی تھی، لیکن ہر شخص یہ بھی جانتا تھا کہ اب وہ بھی اُسی کی طرح
ایک فلیٹ کے مالک ہیں اور بس۔ پھر بھی کچھ لوگ اُن کا خیال کرتے تھے اور اُنہیں
دیکھتے ہی پاس جا کر باتیں کرنے لگتے تھے یا تیج تہوار میں اُنھیں گھر آنے کی دعوت دیتے
وقت صرف اُن کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیتے تھے۔ ''مسر کھ بابو آپ کے پتا جی بڑے
دُور درشی تھے نہیں تو کوئی اور ہوتا تو پچاس سال پہلے شہر سے اتنی دُور یہ زمین خرید تا۔ اُن
دنوں تو یہاں کھیتی ہوتی رہی ہوگی''۔

مسر کھ بابو کا سینہ فخر سے پھول جاتا اور چالیس برس تک دفتر میں نوکری کرنے
کی وجہ سے جو عادت پڑ گئی تھی اُس کے مطابق اُن کے منہ سے نکلتا ''سر، یہ سارا علاقہ''
لیکن فوراً ہی اُنہیں اپنی غلطی کا اندازہ ہو جاتا اور وہ جملہ نئے سرے سے شروع کرتے
''یہ زمین پسند تو پتا جی نے کی تھی لیکن منظوری دادا جی سے بھی لی تھی اور رجسٹری تو دادا جی
نے ہی کرائی تھی۔ سب لوگ روکتے تھے کہ کہاں جنگل میں زمین خرید رہے ہو''۔ یہ کہتے
کہتے وہ اپنی چھڑی سے گیٹ کے باہر والی سڑک کی دوسری طرف اشارہ کرتے ''وہاں
سے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ میں تو اُس وقت چھوٹا تھا لیکن اچھی طرح یاد ہے۔ لوگ پتا
جی سے کہتے تھے کہ رات میں وہاں سیاروں کی آواز سنائی دیتی ہے''۔

وہ اِس جملے کا اثر جاننے کے لیے مخاطب کے چہرے پر نظر ڈالتے اور اُنہیں
اندازہ ہوتا کہ پتا جی اور دادا جی کی دُور اندیشی کا رنگ اُس پر چڑھ گیا ہے تو ایک کوٹ اور
کر دیتے ''بھائی صاحب پہلے زمانے کے لوگ دیکھنے میں تو سیدھے سادے لگتے تھے،
کوٹ پینٹ نہیں پہنتے تھے لیکن ہوتے تھے عقل والے''۔ یکا یک اُنہیں احساس ہوتا کہ
جس شخص سے وہ یہ کہہ رہے ہیں وہ خود سوٹ بوٹ میں ہے تو فوراً بات کا رُخ بدلتے
''لیکن صاحب کپڑوں سے کیا ہوتا ہے عقل ہونا چاہیے عقل۔۔۔۔ آپ سے نہیں لوگوں

نے کہا تھا کہ تیرہ لاکھ میں فلیٹ مہنگا ہے لیکن کیول چار سال میں ہی اُس کی قیمت ڈیوڑھی نہیں تو سوا گنی تو ہو ہی گئی''۔ اپنی دلیل میں وزن پیدا کرنے کے لیے وہ ''کاسماس'' کی عمر دو ڈھائی سال کم کر دیتے۔

ویسے اتنی دیر تک بات چیت کرنے کے لیے مسر کھ بابو کو کم ہی لوگ ملتے تھے، کچھ اُنہیں دیکھ کر دُور ہی سے کنّی کاٹ جاتے، کچھ اُن کے نمستے یا رام رام کا جواب دے دیتے اور کبھی کبھی اُن کی صحت کے بارے میں بھی پوچھ لیتے اور کچھ دوسرے مسکراہٹ سے آگے نہ بڑھتے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جو اُن سے عاجز آ چکے تھے اور اُنہیں دیکھتے ہی کسی دوسرے سے اتنی گمبھیرتا سے باتیں کرنے لگتے جیسے اُنہیں دیکھا ہی نہ ہو۔

اِس سلسلے میں اُن کی آخری پناہ گاہ اُن کے پُرانے کرایہ دار تھے۔ وہ سمجھتے جو بھی ہوں لیکن ظاہر یہی کرتے تھے کہ مسر کھ بابو مہربانی نہ کرتے تو اُنہیں یہ فلیٹ شاید ہی مل پاتے اور یہ کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا لیکن میکو کو کمرہ نُما کوٹھری تو صرف اُن ہی کی وجہ سے ملی تھی اور وہ اُن کو مالک اب بھی کہتا تھا۔ بات چاہے جہاں سے شروع ہو مسر کھ بابو گھما پھرا کر میکو کو بیچ میں لے ہی آتے اور پھر سینہ پُھلا کر کہتے ''پتا جی اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ لوگ اُسے کوٹھری دینے کو تیار نہ ہوتے تو میں زمین اُن کے ہاتھوں ہرگز نہ بیچتا، کون سی بارات نکلی جا رہی تھی۔ مجھے کیا ملا، بس ایک فلیٹ۔ اِس سے بڑے مکان میں تو میں پہلے بھی رہتا تھا۔ وہ اُن سینتالیس لاکھ روپوں کا کوئی ذکر نہ کرتے جو اُنہیں نقد ملے تھے اور نہ بڑے بازار میں بجلی کے سامان کی اُس شاندار دوکان کا جو تین لاکھ روپوں سے اُنھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو کُھلوا دی تھی جس نے کسی طرح ہائی اسکول تک پاس کر کے نہ دیا تھا۔

اُن کے پُرانے کرایے داروں میں دو تو ایسے تھے جن کا کہنا تھا کہ اُنہوں نے مسر کھ بابو کے دادا کا دیہانت بھی دیکھا تھا۔ ''وہ ذرا جلدی سدھار گئے تھے، بھرا پُرا خاندان چھوڑ کر'' وہ کہتے لیکن میکو کی بات نکلتی تو وہ اپنا سر کھجانے لگتے۔ اُوم بابو کہتے وہ پُرانا نوکر ہے لیکن کتنا پُرانا اس بارے میں کچھ نہ کہتے۔ ''ہاں یہ ضرور یاد ہے'' وہ دماغ پر

زور دیتے ''کہ تب اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔'' کا ساس'' کے شروع کے دنوں میں بھی ایسا کالا نہ تھا''۔ پھر وہ اپنے آپ سے کہتے ''سمے سب کچھ بدل دیتا ہے''۔

کوئی کہتا میکو کالا تو اب بھی نہیں ہے تو وہ کہتے ''آپ نے تو سچ پوچھیے اُسے اب جانا پہچانا ہے۔ میں تو اُس میکو کی بات کر رہا ہوں جسے میں نے بہت سال پہلے دیکھا تھا''۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے اُنہیں اپنی تیس سال پہلے کی اُس تصویر کا خیال آجاتا جو ڈرائنگ روم کی الماری میں سجی تھی۔ ''میں ہی کیا تھا، اب کیا ہو گیا ہوں'' کچھ ایسی ہی بات سیٹھ جی بھی کہتے۔ وہ سیٹھ تھے نہیں لیکن اُن کی توند اتنی بڑھ گئی تھی کہ لوگ اُنہیں ''سیٹھ جی'' کہنے لگے تھے۔ وہ کہتے ''ہے تو یہی، لیکن ایک دن شاید اُس کا بھائی بلاسپور سے آیا تھا۔ آپ دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھیں تو ممکن ہے دھوکا کھا جائیں۔ ویسے ہر آدمی دوسرے سے کچھ نہ کچھ الگ تو ہوتا ہی ہے''۔ پھر بھی اوم بابو اور پرانے مکانوں کے ایک دو کرایے دار جو اُس وقت موجود ہوتے اپنے اپنے طور پر یہ فیصلہ ضرور کرتے کہ وہ اس بارے میں میکو سے پوچھ لیں گے۔

اِس بات کا پکّا فیصلہ جو لفظوں میں چاہے نہ ہوا ہو، دو بار تو ہو ہی چکا تھا لیکن ہوتا یہ کہ میکو سے ملاقات یا تو اُس وقت ہوتی جب اُسے کسی کام کے لیے بلایا گیا ہو یا یہ کہ اُسے دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا۔ ایسے میں اُس سے کوئی ایسی بات بھلا کیسے پوچھی جاتی جس کا جواب مشکل ہی سے ہاں یا نہیں میں دیا جا سکتا ہو۔

کامن روم میں یوں تو دس بارہ لوگ دن کے وقت بھی ہر روز ہی موجود ہوتے لیکن شام میں بھیڑ بڑھ جاتی اور اتوار کے دن تو کبھی کبھی کرسیاں کم پڑ جاتیں اور لوگوں کو جگہ خالی ہونے کا انتظار بھی کرنا پڑتا۔ ایسے ہی ایک اتوار کو جب اکتوبر کے آخری تین چار دنوں میں جاڑے جیسے ایک دم آسمانوں سے اُترنے لگے تھے، چند بڑے بوڑھوں نے فیصلہ کیا کہ اگلے اتوار کو کھلے میں دھوپ کا مزا لیا جائے گا۔ ''ویسے اچھا تو یہ ہوتا کہ پکنک منانے کے لیے کہیں جایا جاتا'' مہروترا جی نے، جو کئی دنوں سے کیرم کلب بنانے پر زور دے رہے تھے، کہا تھا ''لیکن اتنے بہت سے لوگ لد پھند کر کہاں جائیں گے

،اس لیے پکنک کا مزا کورٹ یارڈ میں ہی کیوں نہ اُٹھا لیا جائے'' اس تجویز کو پسند سب ہی نے کیا تھا اور اُسی وقت یہ بھی فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ تیس تیس روپے کینٹین کے مالک کو دے کر چائے ، کافی ، پکوڑیوں اور ایک میٹھے کا انتظام اُس کے سپرد کردیا جائے گا۔ لیکن سگریٹ پان اُس میں شامل نہیں ہوگا کیوں کہ ہر شخص تو اُن کا شوق کرتا نہیں۔

کندن لال جی کو مذاق سوجھا تو اُنہوں نے کہا ''میں تو بھائی بیس ہی روپے دوں گا''

''کیوں صاحب بیس روپے کیوں؟'' مہروترا جی سمجھے کہ شاید کندن لال بیس روپے ہی کافی سمجھتے ہیں۔

''میں Diabetic جو ہوں۔ نہ میٹھا لوں گا نہ چائے کافی میں شکر''۔

سب لوگ ہنس دیے اور اِس ہنسی نے فیصلہ پکّا کردیا۔

آج وہی اتوار تھا۔

سردی ذرا چمک گئی تھی ۔جانے کہاں سے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے آسمان میں چُھپا چُھپوّل کھیلنے لگے تھے اور جب اُن میں سے کوئی دھوکے سے سورج کی روشنی میں پناہ لیتا جہاں وہ اور بھی زیادہ نظر آنے لگتا تو کوئی کرسی پر سے مفلر اُٹھا کر گلے میں لپیٹ لیتا اور کوئی کوٹ کا ایک بٹن اور بند کرلیتا اور کوئی کینٹین کے ملازم سے کہتا ''چائے، خوب گرما گرم''۔

الگ الگ رنگوں کی بید کی کرسیاں جو گھروں سے آئی تھیں، کیوں کہ کینٹین میں تو بس تھوڑی سی تھیں، قطاروں میں لگادی گئی تھیں لیکن دھیرے دھیرے وہ بے ترتیب ہوگئیں اور چھوٹے چھوٹے گروپ اِدھر اُدھر گپ شپ میں مصروف تھے۔ ہر شخص اپنے گروپ کی باتوں میں کھویا ہوا تھا لیکن کسی طرف سے قہقہے بلند ہوتے تو دوسروں کی نگاہیں اُدھر ضرور اُٹھ جاتیں۔

اتنے میں ایک عورت، عمر یہی کوئی تیس پینتیس کی رہی ہوگی، پانچ چھے سال

کے ایک بچّے کی اُنگلی تھامے گیٹ پر آئی تو چوکیداروں نے اُسے روکا لیکن معلوم نہیں اُس نے اُنہیں کیا بتایا کہ پہلے تو ایک چوکیدار نے میکو کی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا پھر آگے بڑھ کر دُور سے کوٹھری دکھا بھی دی اور وہ دھیرے دھیرے اُس طرف قدم بڑھانے لگی۔ اتنے میں میکو جو خان صاحب کے لیے اُن کی پسند کی سگریٹ لینے گیا ہوا تھا لوٹا اور چوکیداروں نے اُس سے کچھ کہا تو اُس نے اپنی ساری ادائیں بھلا کر سگریٹ کا پیکیٹ اور باقی پیسے خان صاحب کے حوالے کیے اور اُس عورت کی طرف لپکا جو دُور ہی سے کوٹھری پر تالا لٹکتا ہوا دیکھ کر وہیں رُک گئی تھی، کچھ لجائی لجائی سی لگتی تھی اور دھوپ میں کھڑی چپکے چپکے خوبصورت فلیٹوں کو دیکھ رہی تھی۔

حیرت تو سب ہی کو ہوئی تھی اور وہ اپنی باتیں بھول گئے تھے لیکن کندن لال جی سے، جن کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے، صبر نہ ہو سکا اور اُنہوں نے راستے ہی میں میکو کو روک کر اُس سے پوچھ لیا۔

''ابے میکو۔ یہ عورت تیری کیا لگتی ہے؟''

''مہرارو ہے شاب۔'' میکو بس ذرا سا رُکا اور پھر عورت کی طرف مڑ گیا اور جیسے ہی وہ اُس کے پاس پہنچا بچّے نے عورت کے ہاتھ سے اپنی اُنگلی چھڑا کر میکو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

ذرا کی ذرا میں میکو جو ہمیشہ کی طرح ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے تھا، اُنہیں کچھ ایسا نظر آنے لگا جیسا اُنہوں نے اُسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ پہلی بات اُنہوں نے یہ محسوس کی کہ اُسے جوان نہیں کہا جا سکتا تو ادھیڑ کہنا بھی کچھ ایسا صحیح نہیں ہوگا۔ اُس کی گردن سیدھی تھی، جھکی ہوئی نہیں اور بڑھے ہوئے شیو کے تقریباً سیاہ بالوں کے پیچھے اُس کے چہرے کی جلد چکنی اور چمکدار تھی۔

حیرت ہر ایک کو تھی، کسی کو کم کسی کو زیادہ، لیکن پہلے جہاں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی گپ شپ کی وجہ سے فضا میں ایک طرح کی بھنبھناہٹ چھائی ہوئی تھی وہاں اب تقریباً سنّاٹا تھا، ایسا کہ کوئی بات کرتا تو دو میز اُدھر تک سنائی دیتی۔

یہ حالت تو تھوڑی دیر میں ختم ہو گئی لیکن پہلے والی چہل پہل لوٹ کے نہ آئی۔

''پرنتو مسرکھ بابو تو کہتے ہیں میکو اُن کے پتا جی کے زمانے کا نوکر ہے۔''

کندن جی نے کئی مہینے پہلے کی بات سے سرا جوڑتے ہوئے ''پرنتو'' لگایا۔

''میں بھی جب پرانے مکان میں آیا تھا تو میکو وہاں رہتا تھا'' مہروترا صاحب نے کہا تو رسان سے تھا لیکن اُس میں شرارت چھپی ہوئی تھی۔ اُنہیں معاملہ کچھ دوسرا ہی لگ رہا تھا۔

''آپ کو خوب اچھی طرح یاد ہے''، کندن جی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''وہاں کبھی اُس کی مہرارو کو بھی آپ نے دیکھا تھا''۔

مہروترا صاحب کچھ سوچنے لگے۔ جواب دینے کے لیے اُن کے ہونٹ بھی ہلے لیکن وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔ گردن اُٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا، کان کے اوپر سر کے بالوں کو دھیرے دھیرے کھجایا، پھر بولے ''رہتی تو وہاں نہیں تھی شاید لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ آتے جاتے اُسے دیکھا ضرور تھا۔ پر ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے کچھ کچھ خیال ہوتا ہے کہ وہ ذرا بڑی تھی۔''

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟'' کندن جی چہکے۔ ''ضروری تو نہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ عمر بڑھے ہی۔ جیسے بڑھتی ہے ویسے ہی گھٹ بھی سکتی ہے۔'' وہ شرارت سے مسکرائے۔

جس نے بھی یہ بات سنی وہ ہنس دیا۔

اب ماحول تھوڑا تھوڑا غیر سنجیدہ ہونے لگا تھا اور کندن لال جی یہ نہیں چاہتے تھے کہ اتنا زبردست اسکینڈل ہنسی مذاق میں اُڑ جائے۔ اِس لیے اُنہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''مہروترا صاحب اگر سات آٹھ سال پہلے وہ چار پانچ سال بھی بڑی ہوتی تو اب اِس لائق بھی نہ ہوتی کہ اُنگلی پر لٹکائی جا سکے''۔ اُنہوں نے چاروں طرف دیکھا اور قیں قیں کر کے ہنسے۔

بات اتنی دل کو لگنے والی تھی کہ اُن کی ''قیں قیں'' بھی اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکی اور وہ لوگ بھی جو اَب تک اِس بحث سے الگ تھلگ سے تھے، اُن لوگوں کو چھوڑ کر جن

سے بات چیت کا سلسلہ اُنہوں نے اُس وقت تک توڑا نہ تھا اور اُن باتوں کو بھول کر جو وہ اُس وقت کر رہے تھے، میکو کی مہر اور میں دلچسپی لینے لگے۔

اتنے میں کندن لال جی کی نظر میکو پر پڑی جو ایک میلا سا تھیلا ہاتھ میں لیے اپنی بیوی اور بچے کے لیے شاید کچھ لینے جار ہا تھا تو اُنہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلایا اور جب وہ بالکل پاس آ گیا تو کڑک دار آواز میں اُس سے پوچھا۔

''ابے میکو تو یہاں کتنے برسوں سے ہے؟''

سوال میکو کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سمجھ میں کیا نہیں آیا، اصل میں وہ اُلجھ یوں گیا کہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ اِس طرح کی کوئی بات بھی پوچھی جا سکتی ہے۔

''ہاں ہاں تو۔ میں نے پوچھا یہ تھا کہ تو ''کاساس'' میں کتنے برس سے ہے؟'' کندن لال جی نے رسان سے پوچھا۔

''شاب پانچ سال سے'' اُس نے اُنگلیوں پر حساب بھی نہیں لگایا۔

کندن لال جی نے مہروترا صاحب کی طرف دیکھا۔ کہا کچھ نہیں لیکن جس طرح وہ اُنہیں دیکھ رہے تھے، اُس میں یہ سوال چھپا ہوا تھا کہ آپ نے تو اُس کی بیوی کو بھی کامپلکس بننے سے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ لیکن مہروترا صاحب نے اُس سوال کو، جو پوچھا نہیں گیا تھا، کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنی ہی اُلجھن میں کھوئے رہے۔

مہروترا صاحب نے میکو پر ایک اور سوال داغ دیا۔

''اور تجھ سے پہلے یہاں کون تھا؟''

''یہاں؟''

''ہاں ہاں یہاں!''

''چاچا جی تھے شاب!''

''چاچا جی!'' کندن لال جی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اُنہوں نے اپنے حساب سے بال کی کھال نکالی۔

''لیکن میکو؟'' اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ سوال کس طرح پوچھیں۔

''میکو شاب؟'' وہ ذرا سا ہنسا ''ہمارے پریوار کا تو جو آدمی بھی لوگوں کے گھروں میں نوکری کرتا ہے اُسے سب لوگ میکو ہی کہتے ہیں''۔

کندن لال جی نے جو ساٹھ سال کی عمر پوری کر لینے پر پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے رٹائر ہوئے تھے مجرموں سے پوچھ پچھ کے اپنے تجربے کا استعمال کیا۔

''گھر کی بات نہیں۔تو یہاں میکو کیسے ہو گیا؟''

میکو کو اس سوال میں کوئی اُلجھن کی بات دکھائی نہ دی ''گھر میں تو شاب میں اب بھی شری لال ہوں۔ پرنتو نوکر ہم میکو ہی ہوں، چاچا بھی میکو ہی تھا۔''

اب تو معاملہ کچھ کا کچھ ہو گیا تھا اور ہر ایک کی دلچسپی بھی بڑھ گئی تھی۔ بائیں جانب بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے جو اس معاملہ میں اب تک کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہے تھے اور سامنے والی کرسی پر پیر پھیلائے ہوئے تھے،لیکن اِس طرح کہ اُن کے پیروں کا رُخ کسی کی طرف نہ ہو،میکو۔ سے پوچھا۔

''اور تیرے چاچا سے پہلے؟''

''شاب میں ٹھیک سے نہیں جانتا لیکن چاچا جی کہتے تھے کہ اُن کے ماما کا بھائی تین برس پُرانے مکان کی کوٹھری میں رہا تھا'' میکو نے کچھ اِس طرح جواب دیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

یہ ساری باتیں کئی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک کی جگہ دوسرا نوکر آ جائے اور کسی کو پتہ ہی نہ چلے اور وہ بھی ایسا جس کا ہر روز کئی لوگوں سے سامنا ہوتا ہو۔اُن لوگوں کی بات تو خیر کسی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے جن کا ''کا سماس'' کی تعمیر سے پہلے میکو سے کوئی لینا دینا نہ تھا کیوں کہ اُن کے اپنے اپنے نوکر ہیں اور اُس سے اُنہیں کوئی کام اُسی وقت پڑتا ہے جب اُن کے یہاں کام کرنے والا ایک آدھ دن کے لیے غائب ہو جاتا ہے لیکن اُن لوگوں کو کیا ہو گیا تھا جو برسوں سے اِسی جگہ کے پُرانے مکانوں میں رہتے تھے،اور خاص طور سے مسر کھ جی کو۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی،لیکن سب سے زیادہ اُلجھن میں مہرو ترا جی تھے جن کا خیال تھا کہ اُنہوں نے پُرانے

مکان میں رہنے کے دوران میکو کی بیوی کو دیکھا تھا۔ مانا کہ وہ میکو آج کے میکو کا چاچا تھا لیکن اُن کی آنکھوں کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ عورت کو پہچاننے میں دھوکا کھا گئیں۔ وہ میکو کی طرف دیکھتے اور پھر آنکھیں بند کر کے پُرانے والے مکان کے میکو اور اُس کی بیوی کی تصویر ذہن میں بنانے کی کوشش کرتے تو دُھند میں سے ایک چہرا اُبھرتا اور دھیرے دھیرے میکو بن جاتا۔ بس یہ ہوتا کہ کبھی اس کا رنگ ذرا صاف ہوتا اور کبھی کچھ دبتا ہوا۔ کبھی بال چھوٹے ہوتے اور کبھی تھوڑے سے بڑے لیکن وہ ہوتا میکو ہی یا پھر بالکل میکو ایسا۔

اور پُرانے مکان میں آنے والی اور اِس میکو کی بیوی کی صورت، جسے اُنہوں نے خاصے غور سے دیکھا تھا اور جس کا ناک نقشہ اُن کے دماغ میں تازہ تھا، جب وہ بند آنکھوں میں بنانے کی کوشش کرتے، تو کئی شکلیں ابھر آتیں جو دوسرے سے بہت زیادہ مختلف نہ ہوتیں، کبھی اُن کا رنگ صاف ہو جاتا اور کبھی مٹ میلا۔ لیکن سب سے زیادہ اُلجھن میں ڈالنے والی بات یہ تھی کہ اِن خیالی چہروں میں میکو کا بھی کچھ نہ کچھ رنگ ہوتا۔

اِن ساری باتوں کا میکو کو کچھ بھی اندازہ نہ تھا اس لیے وہ پریشان نظروں سے کبھی ایک چہرہ دیکھتا، کبھی دوسرا اور کبھی تیسرا۔

رتن منی جی نے جو شاید اُس کے بارے میں سب سے زیادہ سوچ چکے تھے اور اب تک خاموش بیٹھے تھے یکایک میکو سے پوچھا۔

''کیا تیرا چاچا بھی شاب بولتا تھا؟''

''ہاں شاب!''

''لیکن تو نیپالی تو ہے نہیں''

''نہیں صاحب، ہم تو بلاسپور کا ہے۔ لیکن شاب ہم لوگ ایسا کام کرتے ہیں تو شاب ہی بولتے ہیں۔ چاچا بھی شاب بولتا تھا۔ اُسی نے سکھایا تھا''

''تو صاحب بول لیتا ہے؟''

''ہاں ساب''

اُس کا جواب سن کر کئی لوگ ہنس دیے تو اُس نے پوچھا۔

''کوئی کام ہے شاب''

''نہیں ،کوئی کام نہیں''۔ دو تین لوگوں نے ایک ساتھ کہا تو وہ گیٹ کی طرف چل دیا۔

یہ سب اُس دن جب اُسے پچاس ہزار روپے لے کر سکینہ جی کے یہاں بھیجا تھا معلوم ہوتا تو وقت ذرا آسانی سے کٹ جاتا۔ رتن منی جی نے دل ہی دل میں سوچا اور مسکرا دیے۔

سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن اب اُن کے چہروں پر پہلے والی اُلجھن نہ تھی۔ پھر بھی اصل سوال کا جواب تو اب بھی نہیں ملا تھا۔ دو بار آدمی بدل گئے اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔ اتنے میں کچھ کہنے کے لیے مہروترا جی کی فوجی مونچھیں پھڑکیں تو سب اُن کی طرف دیکھنے لگے۔ اُن کی مونچھیں کچھ کہنے کے لیے نہیں پھڑکی تھیں، ہوا بس یہ تھا کہ اُنہوں نے مسئلہ کے سارے پہلوؤں پر اِس طرح سے سوچنا شروع کیا تھا جیسے وہ میدانِ جنگ میں ہوں اور دماغ میں دشمن کی ہر ممکن چال اور اُس کا توڑ بٹھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ فرق بس اتنا تھا کہ یہاں دشمن کی فوجیں دُور دُور تک نہ تھیں۔ کبھی کبھی اُن کی مونچھیں پھڑکنا بند کر دیتیں لیکن ذرا ہی دیر میں یہ سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ مگر جب اُنہیں اندازہ ہوا کہ سب اُن کے مُنہ سے کچھ نہ کچھ سننے کا انتظار کر رہے ہیں تو اُنہوں نے کچھ کہا، اتنے دھیرے سے جیسے اپنے آپ سے کہہ رہے ہوں۔ لیکن شرما جی نے جن کی کرسی اُن کی کرسی سے سٹی ہوئی تھی یہ بات کچھ کچھ سن لی اور اُن سے پوچھا۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں مہروترا جی، ذرا ہم سب کو بھی تو بتایئے؟''

''کچھ نہیں،'' مہروترا جی نے کہا، ''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ سارے نوکروں کی صورتیں قریب قریب ایک سی کیوں ہوتی ہیں۔۔۔۔ ایک دوسرے سے ملتی جلتی''

یہ تو نہیں معلوم کہ یہ بات سن کر ہر ایک کو اطمینان ہو گیا تھا یا نہیں لیکن اب اُن کے چہروں پر نہ پہلے والی حیرت تھی، نہ اُلجھن اور کئی تو یہ سوچنے لگے تھے کہ جب بھی وہ نوکر بدلتے ہیں تو اتنی جلدی سب کچھ پہلے جیسا کیوں ہو جاتا ہے۔

■ ■

صفیہ کو غصّہ کیوں نہیں آتا؟

صفیہ کے اِس وقت آنے پر ذرا حیرت ہوئی، ذرا کیا خاصی حیرت ہوئی کہ اُسے فرصت کیسے مل گئی بے وقت آنے کی۔

ہر روز صبح صبح آتی ہے، آندھی پانی کی طرح، اور کہتی ہے۔

''آپا کتنی روٹیاں پکا دوں؟''

میں کہتی ہوں ''کیسیرول دیکھ لے، رات کی بچی ہوئی تو نہیں ہیں۔''

وہ کیسیرول اُٹھاتی ہے تو مجھے یاد آ جاتا ہے اور میں کہتی ہوں۔

''رہنے دے، نو میں سے دو شریف کو دیں، دو پرنس کو دی گئیں، ڈیڑھ ڈیڑھ ہم دونوں نے کھائیں۔ دو بچی تھیں وہ۔۔۔'' میں کہتے کہتے رُک جاتی ہوں۔

''تو ایسا کر۔ تو ہی پکا لے۔''

''شام کے لیے آٹا گوندھ دوں؟''

''اور نہیں تو کیا؟۔ لیکن زیادہ مت گوندھنا، گرمیوں کے دن ہیں، ذرا سی دیر میں تو خمیر اُٹھ آتا ہے۔''

وہ جھٹ پٹ آٹا گوندھتی ہے، روٹیاں پکاتی ہے اور گوندھا ہوا آٹا فرج میں رکھ کر میرے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے کہ جیسے کہنے ہی والی ہو "تو آپا میں جاؤں؟"

"روٹیاں کیسیرول میں رکھ دیں؟" میں پوچھتی ہوں

صفیہ پیشانی پر دھیرے سے ہاتھ مارتی ہے کہ نہ جانے کیسے روز کا کام بھول گئی اور روٹیاں کیسیرول میں رکھ دیتی ہے۔

میں کہتی ہوں "شام کو روٹی کا کپڑا ضرور بدل دینا۔ یاد رکھا کر۔ کتنے دن کا ہو گیا؟" پھر جیسے اپنے آپ سے کہتی ہوں "اتوار کو بدلا تھا، آج چار دن ہو گئے"۔

"ہاں آپا" وہ کہتی ہے "شام کو ضرور بدل دوں گی۔"

"دھو دیا تھا نا؟"

"دو دو دُھلے رکھے ہیں۔ میں تو فوراً ہی دھو ڈالتی ہوں۔"

میں اُس کی طرف ذرا حیرت سے دیکھتی ہوں۔ کلی پھندنے وہ عام طور سے لگاتی نہیں، پھر اُس نے جملے کا دوسرا حصہ کیوں کہا۔ "یوں ہی مُنہ سے نکل گیا ہوگا" میں سوچتی ہوں لیکن اس سے کچھ کہتی نہیں۔ حیرت یوں بھی ہوتی ہے کہ وہ لمبے لمبے جملے بولنے لگے تو ایک آدھ جگہ کا کام اُسے شاید چھوڑنا پڑ جائے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُس نے یہ بات اس طرح سوچی ہے یا نہیں جیسے میں سوچ رہی ہوں، مجھے خیال آتا ہے۔ لیکن اُسی لمحہ میری نظر اُس پر پڑتی ہے تو سمجھ جاتی ہوں کہ کیا کہنے والی ہے۔ اِس لیے سر سے اشارہ کر دیتی ہوں اور وہ سلام کر کے چلی جاتی ہے۔

اب وہ نگار کے یہاں جائے گی جہاں اُسے پورا کھانا پکانا ہوگا۔ ایک اور گھر بھی اُس نے پکڑ لیا ہے۔ ایک دن خود ہی بتا رہی تھی، آٹا گوندھتے گوندھتے۔ لیکن میں نہیں جانتی کہ وہ لوگ کہاں رہتے ہیں اور کیسے لوگ ہیں۔

صفیہ میرے یہاں تین چار سال سے کام کر رہی ہے۔ مجھے نہیں یاد کہ اُس نے کبھی کچھ مانگا ہو، خود سے کچھ دے دیتی ہوں تو باورچی خانے میں بیٹھ کر کھا لیتی ہے اور نل سے ہاتھ مُنہ دھو کر دوپٹے سے پونچھنے لگتی ہے۔ میں اُس کے سوال کا انتظار نہیں

کرتی اور آنکھوں سے اشارہ کر دیتی ہوں۔ وہ جلدی میں ہوتی ہے تو سلام کے لیے ہاتھ بھی نہیں اُٹھاتی۔ میں مسکرا دیتی ہوں۔

شاید کئی مہینے پہلے ایک بار خیال آیا تھا کہ یہ بات مسکرانے کی نہیں ہے، خواہ مخواہ افسردہ ہونے کی بھی نہیں ہے۔ لیکن دوسروں کی مجبوری کے بارے میں کبھی کبھی سوچ لینے میں کوئی برائی نہیں، شاید اس میں کچھ اچھائی ہی ہو۔ اس کے باوجود یہ خیال مجھے کئی سال بعد کیوں آیا؟ میں سوچتی ہوں۔

کچھ دنوں بعد ایک دن جانے کیسے مجھے یکا یک احساس ہوا کہ میں ایک اور بات جانتی ہوں۔ صبح کے وقت اُسے کچھ کھانے کو دیتی ہوں تو وہ فوراً ہی کھانے بیٹھ جاتی ہے لیکن شام کو جو بھی دوں دوپٹے کے پلّو میں باندھ لیتی ہے، گھر لے جانے کے لیے۔

جھاڑو پونچھے اور برتن دھونے کے لیے جو بوا ہیں وہ آرام سے آتی ہیں، اپنا سارا کام کر کے، دوسری جھگّی جھونپڑی میں رہنے والوں کے جھگڑے نپٹا کر۔ اُس کی تو خیر میں عادی ہو چکی ہوں لیکن کبھی بہت دیر کر دیتی ہیں تو کہتی ہوں ''بوا ذرا گھڑی تو دیکھو۔ ساڑھے دس بج رہے ہیں، یہ وقت ہو گیا اور اب تک جھاڑو بھی نہیں ہوئی۔'' وہ سنی اَن سنی کر دیتی ہیں اور کچن سے برتن اُٹھا کر باہر نل پر لے جانے کا سلسلہ جاری رکھتی ہیں۔ برتن تو تھوڑے سے ہی ہوتے ہیں لیکن اُنہیں معلوم ہے کہ مجھے اُن کے ایک دوسرے سے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی آواز اچھی نہیں لگتی اس لیے کئی چکّر لگاتی ہیں۔ میں یہ سوچ کر خوش ہو جاتی ہوں کہ اُنہیں کچھ تو میرا خیال ہے۔ گھڑی دیکھنے کی بات کہہ کر میں آپ ہی آپ مسکراتی ہوں کہ ہر بار یہ طے کرنے کے بعد بھی کہ اِس سلسلے میں اُن سے کچھ کہنا بیکار ہے، بھول جاتی ہوں کہ وہ گھڑی نہیں دیکھ سکتیں۔ اِس لیے نہیں کہ اب ان کی آنکھیں بہت کمزور ہو گئی ہیں بلکہ اُنہیں معلوم ہی نہیں کہ کونسی سوئی کس جگہ ہو تو کیا بجتا ہے۔ ہر روز پاس پڑوس کی کوئی نہ کوئی خبر وہ ضرور لاتی ہیں اور ایسی ایسی کہانیاں سناتی ہیں جن کے اور چھور کا بھی مجھے پتہ نہیں ہوتا۔ ہوں، ہاں، تو کرنا پڑتا ہی ہے لیکن میں اُن کی باتیں ایک کان سے سنتی ہوں اور دوسرے کان سے نکال دیتی ہوں۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو رہ ہی جاتا ہو گا۔

لیکن صفیہ جو بوا سے تین جُھگی چھوڑ کر رہتی ہے، کبھی کسی کے بارے میں کوئی بات کرتی ہے نہ اپنے بارے میں۔ شاید اُس کے پاس اس سب کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ رات کو تھکی تھکائی گھر پہنچتی ہے۔ پلّو میں چاہے جتنا بھی بندھا ہو، اتنا کبھی نہیں ہو سکتا کہ دو بچّوں، شوہر اور خود اُس کے لیے کافی ہو۔ پیپے کے تلے میں تھوڑا بہت آٹا اور پوٹلی میں دال ہوتی ہے تو ''پورا کھانا'' پکا لیتی ہے ورنہ چاول اُبال کے رکھ دیتی ہے۔ میاں کا مُنہ پھول جاتا ہے لیکن بچّے جو بھی مل جائے خوشی خوشی کھا لیتے ہیں، ماں کے ساتھ۔ شوہر بھی خالی پیٹ نہیں سوتا لیکن کھاتا اُس وقت ہے جب سب لوگ سو جاتے ہیں، تھوڑی سی شکر ڈال کے۔ صبح جب اُسے شکر کا ڈبّہ وہاں نہیں ملتا جہاں صبح اُس نے چھپا کر رکھا تھا تو اُسے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے لیکن وہ کہتی کچھ نہیں۔ مُنہ اندھیرے اُٹھ کر میاں کے لیے چائے بناتی ہے اور رات کا بچا کھچا بچّوں کو کھلا دیتی ہے۔ کبھی کبھی جب دل بہت چاہتا ہے تو پتیلی کے پیندے میں سے کنڈا ٹوٹی پیالی میں اُنڈیل کر چائے پینے لگتی ہے۔ میاں کی نظر پڑتی ہے تو کہتا ہے ''اب تو چائے لے کے بیٹھ گئی، دیر ہو جائے گی تو بیگم صاحبہ خفا ہوں گی''۔ وہ کوئی جواب نہیں دیتی اور ٹھنڈی پالا چائے حلق میں اُنڈیل کر میرے یہاں چلی آتی ہے اور زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ میں آٹھ دس روٹیاں ڈال کر چھٹی کر دیتی ہے۔

اصل کام اُس کے بعد شروع ہوتا ہے اور دو گھروں کا سارا کام نپٹانے میں اُسے دن کے دو تو بج ہی جاتے ہیں۔ پھر تین ساڑھے تین بجے اُلٹا چکر شروع ہوتا ہے اور دونوں گھروں سے چھٹی پا کر آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات میں میرے یہاں آتی ہے۔۔۔۔ دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اُس کے ساتھ رہتی ہیں لیکن لڑکا جو دس بارہ سال کا ہے اپنی خالہ کے یہاں رہتا ہے اور سائکل کی مرمّت کا کام سیکھ رہا ہے۔ چار جانوں کا سارا بوجھ اُس کے سر پر ہے لیکن اُس کا میاں اپنا شوق پورا کرنے کے لیے کہیں سے ایک پُرانا دُھرانا ٹی۔ وی سستا مدا خرید لایا ہے۔ سو روپے مہینے میں کٹیا ڈال کر بجلی مل جاتی ہے۔

یہ ساری باتیں مجھے صفیہ نے نہیں بتائی ہیں بلکہ پچھلے تین چار برسوں میں

میرے پوچھنے پر اُس کے ایک ایک دو دو جملوں سے جو کچھ معلوم ہوا ہے اُس سے میں نے یہ تصویر بنائی ہے، اُس میں کچھ نہ کچھ بوا کا بتایا ہوا بھی ہوگا۔

ایک دن میں نے اُس سے پوچھا ''تیرا میاں کیا کرتا ہے؟''

''میاں؟'' اس نے کہا اور ذرا دیر رُک کر بولی ''زردوزی بناتے ہیں''

میں نے سوچا شاید بتانا نہیں چاہتی ہے اور مجبوری میں بتا رہی ہے۔ افسوس ہوا کہ ایسی بات کیوں پوچھی لیکن پھر سوچا کہ اب تو پوچھ ہی لیا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی ہے۔

''زردُوزی! اُس میں تو ٹھیک ٹھاک پیسے مل جاتے ہوں گے؟''

''کہاں آپا۔۔۔ پندرہ دن پر پیسے دیتے ہیں اور اُس میں سے بھی کاٹ لیتے ہیں۔ کاٹ کیا لیتے ہیں، مار لیتے ہیں''

میں سمجھی کہ جملہ پورا ہو گیا لیکن نہیں وہ بس ذرا سا رُکی تھی۔

''کبھی ضرورت پڑنے پر بیس پچیس مانگ لو تو حساب کرتے وقت دگنے کم کر لیتے ہیں۔ کچھ کہو تو کہتے ہیں ایک بار نہیں دو بار لیے تھے۔''

''کچھ لوگ کیسے ہوتے ہیں''، میں نے کہا تو وہ بولی

''اور زیادہ کچھ کہو تو کہتے ہیں زردوزی کے کام کی مانگ اب کم ہوتی جا رہی ہے کوئی اور کارخانہ دیکھ لو۔ چپ ہو جاتے ہیں، کیا کہیں''

کئی مہینے بعد ایک دن، جب نگار، اُن کے میاں اور بچے دو تین دن کے لیے کہیں باہر گئے ہوئے تھے وہ ذرا فرصت میں تھی اور ہر کام دھیرے دھیرے کر رہی تھی۔ مجھے بھی شاید کوئی کام نہ تھا۔ معلوم نہیں میں نے کیا پوچھا تھا کہ اُس نے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی بتا دیا کہ اب میاں گھر پر ہی کام کرتے ہیں۔ چھے سات روپے تو ہر روز ٹمپو کے کرایے میں ہی لگ جاتے تھے۔ کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔ جوڑ بٹور کے ایک اڈّا خرید لیا ہے۔ دوکان سے مال لے آتے ہیں اور بنا کر پہنچا دیتے ہیں۔

میں کچھ بولی تو نہیں لیکن خوش ضرور ہوئی کہ اب اُس کی پریشانیاں تھوڑی

بہت کم ہوگئی ہوں گی۔ اُس کے بعد بہت دنوں تک کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوئی جس سے پتہ چلتا کہ اُس کی پریشانیاں واقعی کم ہوئی ہیں یا نہیں یا میں یوں ہی ، بس اپنے اطمینان کے لیے، خوش ہوگئی تھی۔ آخر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا تو اُس نے بتایا ''آپا پیسے بہت دیر میں ملتے ہیں۔ سیٹھ کہتا ہے مال خرید نے میں جھوا بھر روپے نقد دینا پڑتے ہیں، مزدوری تُرنت کہاں سے دے دیں۔ دھندے میں دیر سویر تو لگی ہی رہتی ہے۔ ذرا صبر کرو، مال بک تو جائے۔''

اُس کی طرف سے مجھے جو تھوڑا سا اطمینان ہو گیا تھا وہ جاتا رہا، پھر بھی میں نے سوچا کہ پہلی بار تو ضرور پریشانی ہوئی ہوگی لیکن ایک بار ڈیوڑھ لگ جائے تو پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو ہی جاتا ہے اور اب تو کئی مہینے ہوگئے ہیں۔ اُس وقت مجھے یہ بھی لگا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے یا پھر کوئی ایسی بات ہے جو وہ بتانا نہیں چاہتی۔ پر میں نے کریدا نہیں تھا۔

چھے سات دن کے بعد ایک دن بے وقت ٹپک پڑی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ آخر اُسے وقت کہاں سے مل گیا۔ میں نے پوچھا تو نہیں لیکن میرے چہرے پر اپنے لیے جو سوال تھا اُسے اُس نے یہ سمجھ لیا کہ میں اُس سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔ وہ مسکرائی، مجھے کچھ عجیب سا لگا کیوں کہ میں نے اُسے مسکراتے ہوئے ذرا کم ہی دیکھا ہے اور غصہ کرتے تو اور بھی کم۔ میں نے سوچا تو نہیں لیکن ہلکا سا خیال ضرور آیا کہ مسکرانے کی تو خیر کوئی بات نہیں لیکن غصہ کرنے کے موقعے بھی غریب کو کہاں ملتے ہوں گے، اور مل بھی جائیں تو یہ بے چاری غصے کا ٹھیکرا کس کے سر پھوڑے گی۔ میاں بھی تو ایسا نہیں کہ اُسی کے سر پہ ایک آدھ بار اپنی یہ حسرت نکال لے۔

میں یہ سوچ رہی تھی یا شاید کچھ بھی نہیں سوچ رہی تھی کہ وہ خود سے بولی۔ ''آپا اب سارے دلدّر ڈھل جائیں گے۔ میاں کو ساڑھے اٹھارہ سو کی نوکری مل رہی ہے۔''

''یہ تو، تو نے اچھی خبر سنائی'' دل میں جو بات آئی میں نے کہہ دی، یہ سوچے بغیر کہ اُس کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

میرے اس جملے سے اُس کی ہمّت بڑھی تو اُس نے کہا ''آپا سات سو روپوں کی ایک دم ضرورت پڑ گئی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے تین مہینوں میں میری تنخواہ سے کاٹ لیجیے گا۔'' پھر اُس نے میری طرف دیکھا اور بات پوری کی ''جو آدمی نوکری دلا رہا ہے اُسے دینا ہیں۔''

''تو بھی کیسی بات کرتی ہے صفیہ''، میں نے کہا ''سو نہ پچاس، پورے سات سو اور وہ بھی مہینے کے آخری دنوں میں!''

اُس نے مایوسی سے میری طرف دیکھا تو میرا دل پسیجا۔ لیکن میں تو کہہ چکی تھی کہ اُس وقت اتنے پیسے ہیں ہی نہیں۔ اب کیا کروں۔ میں سوچنے لگی۔

''وہ آپا بات یہ ہے کہ چاہیے تو مجھے اُس سے زیادہ روپے۔ پانچ سو نگار آپا نے دیے ہیں، دو تین سو میں نے دُکھی بیماری کے لیے چھپا کے رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا تھا سات آٹھ سو آپ سے مل جائیں گے تو سب ملا کر پندرہ سو ہو جائیں گے، بس پانچ سو کا سیتا کرنے کو رہ جائے گا۔

اُس نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔

''آپا دو ہزار ہوتے تو بہت ہیں۔''

اور کیا، کم تھوڑی ہوتے ہیں'' میں نے ایسے کہا جیسے جھوٹ بول رہی ہوں۔

''۔۔۔لیکن ہر مہینے اٹھارہ سو ملنے لگیں گے تو دو تین مہینے میں دن پھر جائیں گے،'' وہ بولی۔

''بات تو ٹھیک کہہ رہی ہے'' میں نے سوچا، پر کیا کروں۔ اب تو کہہ چکی ہوں کہ مہینے کے آخر میں اتنے روپے کہاں سے لاؤں۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ مَیں کوئی ترکیب نکالنے کی کوشش کرنے لگی، روپوں کا انتظام کرنے کی نہیں بلکہ اِس کی کہ اُس کا کام نکل جائے اور میری بات بھی خراب نہ ہو۔ میں کچھ اپنے آپ سے خفا بھی تھی کہ صاف صاف انکار کرنے کی ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ تھوڑا سا صبر سے کام لیتی تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔۔۔ میں صورت ایسی بنائے رہی جیسے سوچ

رہی ہوں کہ روپوں کا انتظام کہاں سے کیا جائے۔

اتنے میں کسی چیز کی تلاش میں ''صاحب'' اپنے کمرے سے نکلے تو میں نے اُن سے پوچھا۔

''آپ کے پاس کچھ روپے تو نہیں ہوں گے؟''

اُنہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ اِس طرح کسی کی موجودگی میں روپوں کے بارے میں شاید ہی میں نے پہلے کبھی اُن سے پوچھا ہو۔ اُنہوں نے دیوار کی گھڑی کی طرف دیکھا تو میں نے اندازہ کرلیا اور کہا۔ ''تھوڑے سے روپوں کی صفیہ کو ضرورت پڑ گئی ہے۔''

''تو دے دیجیے۔''

میں نے اِس ڈر سے کہ اُنہوں نے زیادہ بات کی تو کہیں میرا بھانڈا نہ پھوٹ جائے، کہا ''نہیں، اتنے روپوں کی ضرورت نہیں ہے کہ بینک جایا جائے۔ ویسے بھی آج سنیچر ہے اور ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔ روپے اُسے آج ہی چاہیے۔'' میں نے پیش بندی کی تاکہ صفیہ کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ آپا پھر باقی سارے روپے پرسوں ہی دے دیجئے گا۔

تین چار منٹ بعد ''صاحب'' جنہیں پہلے دفتر کے چپراسیوں اور پھر گھر کے نوکروں کی دیکھا دیکھی میں بھی کبھی کبھی غیروں اور اجنبیوں کے سامنے ''صاحب'' ہی کہنے لگی ہوں، اپنے کمرے سے پھر نکلے اور سو سو کے پانچ نوٹ میرے سامنے کے اسٹول پر رکھ کر لوٹ گئے۔

چار سو تو میرے کرتے کی جیب ہی میں پڑے ہوئے تھے لیکن اپنی بات کی لاج رکھنے کے لیے میں نے صفیہ کی طرف کچھ ایسی نظروں سے دیکھا اور اُٹھی کہ بیڈروم میں جا کر تلاش کرتی ہوں۔ شاید کچھ اور مل جائیں۔

تھوڑی دیر تک وارڈ روب میں کھٹر پٹر کرنے کے بعد میں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر تکیہ کے نیچے رکھ دیے اور باقی ''صاحب'' کے دیے ہوئے روپوں میں شامل کر کے لابی کی طرف بڑھی لیکن پھر رُک گئی اور تکیے کے نیچے سے وہ دونوں نوٹ

بھی نکال کر اُن میں ملا دیے اور مسکرا کر روپے صفیہ کو دیتے ہوئے کہا۔

''لے، تیری قسمت اچھی ہے، نو سو روپوں کا انتظام ہو گیا۔ دُکھی بیماری کے لیے جو دو سو روپے تو نے چھپا کر رکھے ہیں، اب اُن کو ہاتھ نہ لگانا۔''

دل کو اندر اندر، دھیرے دھیرے اب بھی کوئی کھرچ رہا تھا۔ ایک بار تو جی چاہا کہہ دوں کہ یہ روپے واپس نہ کرنا لیکن پھر سوچا ایک جلد بازی کی سزا تو بھگت ہی رہی ہوں دوبارہ سارے پتے ایک بار میں نہ کھولوں، اس لیے بڑی مشکل سے زبان کو قابو میں رکھا۔ لیکن اور کچھ کہنے کے لیے دل مچل رہا تھا۔ اس لیے ایک جملہ ٹانک ہی دیا۔

''میں تو ڈر رہی تھی کہ کہیں میری وجہ سے تیرا کام نہ بگڑ جائے۔''

صفیہ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے سلام کیا اور چلی گئی۔۔۔۔ لیکن دل پر ایک بوجھ سا تھا جو ہٹائے نہ ہٹتا تھا۔۔۔۔ بے کار بہانہ بنایا تھا۔۔۔۔ میرے لیے سات آٹھ سو کیا ہوتے ہیں، خیر ''صاحب'' کے ہاتھوں خدا نے اس کا کام تو بنا دیا، میں نے خود کو تسلی دینے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو یہ بھی سمجھایا کہ روپے تو میں کسی نہ کسی بہانے اُسے دے ہی دیتی لیکن جو ہوا اُس سے اُسے معلوم ہو جائے گا کہ وقت بے وقت کی ضرورت کے لیے کچھ زیادہ روپے بچا کے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ آج کل دو سو روپے کیا ہوتے ہیں۔

اُسی وقت مجھے یاد آیا کہ کئی مہینے پہلے ایک دن اُس نے بتایا تھا کہ اُس کے میاں کا ایک دوست نوکری کے لیے کوشش کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ ڈیڑھ دو ہزار کا خرچ ہے۔ اُس وقت تو میں نے اُس بارے میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا لیکن اب خیال ہوتا ہے کہ بھلا ڈیڑھ دو ہزار میں نوکری ملتی ہے چور اُچکا ہوگا اور اُس کے روپے ڈوب گئے تو بہت بُرا ہوگا۔

دو تین دن میں سب کچھ بھول بھال گئی لیکن ایک آدھ بار یہ خیال ضرور آیا کہ معلوم نہیں کیا ہوا اور اُس کے ساتھ وہ سب بھی یاد آ گیا جو اُس دن ہوا تھا جب وہ روپے مانگنے آئی تھی۔۔۔۔ پھر کئی دن گزر گئے۔ کچھ کچھ یہ انتظار بھی رہا کہ صفیہ اپنے میاں کی نوکری کے بارے میں کچھ بتائے۔ میں نے سوچا کہ اب آئے گی تو خود ہی

پوچھ لوں گی لیکن وہ ایسی آندھی پانی کی طرح آتی اور چلی جاتی کہ میں سوچتی ہی رہ جاتی۔ آخر ایک دن میں نے طے کرلیا کہ جیسے ہی آئے گی میں پوچھ لوں گی۔ اور یہی ہوا۔ وہ آئی اور سلام کر کے کچن کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ میں نے کہا۔

''چائے پی کہ نہیں پی۔ نہ پی ہو تو کیتلی میں رکھی ہے، گرم ہوگی۔ تھوڑی دیر پہلے بنی تھی۔ ٹھنڈی ہوگئی ہو تو گرم کرلے۔ پلیٹ سے ڈھکے دو توس رکھے ہیں وہ بھی لے لے''

''پہلے آٹا گوندھ لوں؟''

''آٹا رہنے دے۔ ہم لوگوں کو کہیں جانا ہے۔ تو جلدی سے چائے پی لے، مارے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔'' میں جانتی تھی کہ اُسے کام نہیں کرنا ہے تو چائے لاہی میں ٹی۔ وی کے پاس بیٹھ کر ہی پیے گی، اُسی وقت پوچھ لوں گی۔ لیکن کہیں یہ نہ سمجھے کہ میں تقاضہ کررہی ہوں اس لیے میں نے سوچ لیا کہ بات ذرا گھما کر کروں گی۔ اس کے لیے میں نے جملہ بھی سوچ لیا لیکن جب وہ چائے کی پیالی لے کر آئی اور بیٹھ گئی تو بات بالکل دوسری طرح شروع ہوگئی، جو میں نے سوچا تھا اُس سے بھی اچھی طرح۔

''اب زَردُوزی کا چکّر تو ختم ہی ہوگیا ہوگا؟'' میں نے کچھ ایسے پوچھا جیسے جواب تو مجھے معلوم ہی ہے۔

''وہ تو آپا کب کا ختم ہوگیا تھا''، اُس نے کہا تو ساری گُلیاں اُڑ گئیں اور میں نے پردے کے لیے جو دیواریں بنائی تھیں وہ اڑ اڑ ادھم ہوگئیں۔

پھر بھی میں نے خود کو سنبھالا اور سیدھے سیدھے پوچھنے کے بجائے بات ذرا دوسری طرح پوچھی۔

''نوکری کریں گے تو زَردُوزی بنانے کا وقت کہاں ملے گا؟

''نوکری کہاں ملی آپا!'' اُس نے کچھ ایسے کہا جیسے کوئی خاص بات نہ ہوئی ہو لیکن پھر کچھ سوچ کر بات کو ذرا بدلنے کی کوشش کی۔ ''آپ لوگوں کا قرضہ بھی چڑھ گیا، روپے پھر بھی پورے نہ ہوئے تو اڈا بیچ دیا۔ سب ڈوب گئے۔ تین دن بعد خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ وہ تو پورا چار سو بیس نکلا آپا''

''قرض کیسا؟'' پیسے میں نے واپس لینے کو تھوڑی دیے تھے۔ نگار بھی شاید ہی روپے واپس لیں۔ اپنا دل چھوٹا مت کر۔ روپے تو آتے جاتے رہتے ہیں''۔

میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتی کہ یہ بات میں نے اُس سے کہی تھی یا اپنے آپ سے۔ پھر بھی میں نے اُسے کریدا۔

''لیکن سارے روپے گئے کہاں؟ پوچھا نہیں تو نے؟''

''پوچھا تھا آپا'' اُس نے کہا'' کہتے ہیں تین دنوں تک دو جانوں کے کھانے پینے پر کتنا کھرچا ہوتا ہے پردیس میں، تو جانتی ہے؟ اور کام ہو نہ ہو پیسے تو لگ ہی جاتے ہیں''

''تو نوکری بعد میں ملے گی۔ اُمید ہے نا؟''

''کہاں کی اُمید آپا۔ کہتے ہیں جب پانچ ہزار ہو جائیں گے تو نوکری مل جائے گی۔ تین دن بارہ بنکی میں ایک دفتر سے دوسرے دفتر گھماتا پھرا، پیسے الگ خرچ کرا دیے''

''تو وہ روپے بعد میں کام آئیں گے؟'' میں نے بات گھما کے پوچھی کہ جھوٹ بول رہی ہو تو کُھل جائے۔

''میں کیا جانوں آپا، کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ'' اُس نے ذرا سا سر اُٹھایا۔

''کہتے ہیں دھوکے باز ہے، تو پھر روز جُھگی میں کیوں بلاتے ہیں؟ جب دیکھو مسکراتا ہوا چلا آ رہا ہے۔

اُس کے مسکرانے کی بات مجھے اچھی نہیں لگی اور میں اُسے بڑا بھلا کہنے ہی والی تھی کہ اُس نے ایک ایسی بات کہہ دی جس سے میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

''کل وہ کیا لگا نے جُھگی کے باہر جیسے ہی گئے تو مجھ سے بولا'' دن بھر کام کرتی ہے اُس پر نہ کھانے کو ملتا ہے نہ پینے کو۔ تھوڑی دیر میں سڑک پر پولیس چوکی کے سامنے ملنا، راشن دلا دوں گا اور روپے بھی دوں گا۔ اتنے میں وہ آ گئے تو دوسری باتیں کرنے لگا۔''

''خبردار جو کہیں گئی'' مجھ سے غصہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ ''اب جو کچھ ایسی ویسی بات کرے تو سر پھوڑ دینا۔ جو ہوگا دیکھ لیا جائے گا۔''

وہ ایسی بیٹھی رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو تو مجھے اُس پر بھی غصہ آنے لگا۔

''سب بگاڑا ہوا تیرا ہی ہے۔ میاں سے کہتی کیوں نہیں کہ کوئی اور کام کرے۔ دنیا جہان میں کیا زَردوزی کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں رہ گیا ہے؟''

''بہت کہا آپا! کچھ کرتے ہی نہیں تو کیا کروں؟''

اُسی وقت مجھے جانے کہاں سے بوا کے بڑے بیٹے کا خیال آ گیا۔ دو سال پہلے اُس نے رکشہ چلانا شروع کیا تھا۔ اب بھی چلاتا ہے۔ خوب پسینہ بہاتا ہے اور پیسے بچاتا بھی ہے۔ اب اُس کے چار رکشے کرائے پر چلتے ہیں، خود بھی رکشہ چلاتا ہے۔ یہ نہیں کہ مالک بن کر بیٹھ گیا ہو۔ بوا نے کئی بار جو کچھ بتایا تھا وہ سب میں نے ایک ہی بار میں انڈیل دیا اور آواز ذرا سی اونچی کر کے یہ بھی کہا۔

''اُس سے کہہ رکشہ ہی چلائے۔''

''کہا تھا آپا! کہتا ہے رکشہ چلا کر ایکسی ڈینٹ میں جان دے دوں!''

اُس کی بات سن کر مجھے ہنسی آنے ہی والی تھی لیکن میں نے بڑی مشکل سے اُس پر قابو پایا اور چہرے پر ناراضگی کے آثار پیدا کرتے ہوئے غصہ میں کہا۔

''تو اُس سے لڑتی نہیں۔ جھگڑا نہیں کرتی؟''

وہ مسکرائی۔

''آپا کتنا لڑوں۔ کتنا جھگڑا کروں۔ ایک دن کی بات ہو تو جی بھر کے لڑ لوں، مار پیٹ بھی کر لوں۔ کب تک روز روز جھگڑا کر کے اپنی جان جلاتی رہوں۔ اُس پر تو کچھ اثر ہوتا نہیں'' وہ ذرا رکی۔ پھر بولی۔

''اور آپا روز روز غصہ کرنے لگوں تو کام کیسے کر پاؤں۔ غصے میں جا نگر بھی تو مارا جاتا ہے''

یہ کہہ کر وہ ایک دم کھڑی ہو گئی، جیسے اُسے کوئی کام یاد آ گیا ہو اور بولی۔

''تو آپا میں جاؤں؟''

▬ ▬

ہنی مون

اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کے بعد کہ اُس کی اُنگلی چار نمبر پر ہی ہے، اُس نے بٹن پر ہلکا سا زور دیا۔ دروازے کے اوپر ایک چھوٹا سا انگارہ دہکا، پھر جیسے اُسے راکھ نے ڈھک لیا، لیکن سرخی اندر سے جھلکتی رہی۔ وہ آپ ہی آپ مسکرایا، بلاوجہ، اور شاید اسی لیے جیسی خاموشی سے مسکراہٹ آئی تھی ویسی ہی خاموشی سے خود بخود بند ہوتے ہوئے لفٹ کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

اُس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی لیکن سر اس بڑی طرح جھنجھنا رہا تھا کہ وہ اُسی میں اُلجھ کر رہ گیا۔

لفٹ میں کوئی اور نہ تھا۔ آنکھیں پوری طرح کھول کر اُس نے ایک بار چاروں طرف دیکھا، صرف یہ یقین کرنے کے لیے کہ کوئی اور ہے یا نہیں۔ کوئی دوسرا وہاں نہیں تھا، اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ اس وقت کوئی فلائٹ آتی تھی نہ ٹرین۔

لفٹ رُکی، دروازہ کھلا، کچھ زیادہ ہی دھیرے دھیرے۔ اسے بھی شاید اندازہ

تھا کہ نویں منزل تک کوئی اس کا انتظار نہیں کر رہا ہے اس لیے خواہ مخواہ جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے باہر نکلنے سے پہلے ایک بار نمبر پڑھا، جو روشن ہو گیا تھا۔ چار ہی معلوم ہوتا ہے، نہیں چار ہی ہے، اس نے سوچا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر نکل آیا۔

سارے ہی کمروں کے دروازے بند تھے۔ ہر تیسرے چوتھے کمرے کے باہر کئی بیرے دیوار سے ٹیک لگائے لگائے ہی سو گئے تھے، پیر پھیلا کر۔ بس دو ایک اب بھی بیٹھے تھے، پتھر کے بتوں کی طرح، ادھ کھلی آنکھوں سے سوتے ہوئے۔ اُنہیں دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ آپ ہی آپ۔ کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

سامنے والے کمرے کا اوپری حصہ اسے دوسرے کمروں کے مقابلے میں کچھ بڑا اور زیادہ گول معلوم ہوا، اور اونچا بھی، لیکن اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اُس کا کمرہ نہیں تھا۔

اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ لفٹ سے نکلنے کے بعد بائیں جانب کی راہداری میں، سامنے کی طرف کا آخری سے پہلے والا کمرہ اُس کا ہے۔ وہ اُس طرف مڑ گیا اور اُنیس نمبر کے کمرے کے سامنے رُک کر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، چابی نکالنے کے لیے، لیکن چابی اُس میں نہیں تھی۔ اُس نے دوسری جیب دیکھی۔ وہاں بھی کوئی سخت چیز نہیں تھی۔ پینٹ کی پیچھے کی جیب سے سب کچھ ایک ساتھ نکالنے کی کوشش میں دو تین نوٹ فرش پر بکھر گئے لیکن اُس نے اُس جانب توجہ نہ کی اور تینوں جیبوں کی دو تین بار تلاشی لی۔ جھک کر نوٹ اُٹھائے، دو تین بار کی کوشش کے بعد کہیں کامیابی ہاتھ لگی۔ لیکن پریشانی اپنی جگہ قائم رہی۔ اُسی وقت اُس کا بایاں ہاتھ قمیص کی جیب سے ٹکرا گیا۔ وہاں کسی سخت سی چیز کا احساس ہوا۔ ہاتھ ڈالا۔ چابی وہاں آرام کر رہی تھی۔ اطمینان ہوا، جتنا اُس حالت میں ہو سکتا تھا۔ گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے ڈیڑھ دو منٹ اُسی طرح کھڑا رہا۔ پھر چابی لگانے کی کوشش کی لیکن دروازے میں پیوست تالے نے اُسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اِس ناکامی نے اُس میں جھنجلاہٹ پیدا

کر دی جس پر قابو پانے کی اُس نے کوشش کی اور اپنے خیال میں کامیاب بھی ہو گیا۔ اپنی اس کامیابی کا خود کو یقین دلانے کے لیے اُس نے اپنے پیر فرش پر مضبوطی سے جمائے، جسم کو پہلے دائیں اور پھر بائیں طرف جھکایا، سب کچھ اُسی طرح ہوا جیسا وہ چاہتا تھا۔ اُسے اطمینان ہوا۔ بس ایک طرف سر ذرا زیادہ جھک گیا تھا۔۔۔

اُس نے تالے کو گھور کر دیکھا، پھر چابی کو، پھر ایک پیر اُٹھایا، جو دھیرے دھیرے ہی ممکن ہو سکا، لیکن جب اُسے فرش پر پٹکا تو اس میں تیزی تھی۔ یہ غصے کا اظہار تھا۔

اُسی وقت اُسے یاد آیا کہ اُس نے چور کھٹکا تو دبایا ہی نہیں ہے جو ایک چھوٹے سے گولے کی شکل میں تھا اور بظاہر دروازے کی خوبصورتی کا حصّہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنی حالت پر دھیرے سے ہنسا، چور کھٹکا دبایا، چابی لگائی لیکن وہ اب بھی تالے کے باہر ہی ٹکی رہی۔۔۔ اُس نے گردن ہلائی، کچھ اِس طرح جیسے خود سے پوچھ رہا ہو کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اُسی لمحے اس کا بایاں ہاتھ گھنٹی کے بٹن کی طرف اُٹھ گیا لیکن فوراً ہی اُسے خیال آ گیا کہ وہ خود تو باہر کھڑا ہے، اندر سے ''کم اِن'' کون کہے گا۔ وہ ہنس دیا۔ اُس بار اُس نے اپنے ہنسنے کی آواز بھی سُنی، اِس ہنسی نے اُسے یاد دلایا کہ آج رات کچھ زیادہ ہو گئی ہے۔

اپنے آپ پر قابو کھو دینے کا یہ اُس کا پہلا موقعہ تھا۔ وہ دو تین پیگ سے زیادہ لیتا نہیں تھا اور اُس کا یہ بھی خیال تھا کہ شراب اس پر ذرا کم ہی اثر کرتی ہے۔ شاید اسی خیال سے آج کی رات اُس نے بار میں خود کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ چوتھا، پانچواں اور پھر چھٹا پیگ حلق میں اُتارتے وقت اُس نے بس یہ سوچا تھا کہ اس قدر خوبصورت فضا اور دلکش اور شاداب چہروں کے درمیان کسی بھی قسم کی پابندی کچھ ایسی اچھی بات نہ ہوگی۔ لیکن اب اسے کچھ کچھ پچھتاوا ہو رہا تھا۔ تاہم اس پشیمانی کی حیثیت اس زوردار قہقہے سے زیادہ نہ تھی جس کے بعد خیال آتا ہے کہ آواز بہت اونچی ہو گئی تھی۔۔۔ تین دن پہلے کی بات اُسے کسی طرح

یادنہیں آرہی تھی۔

سدھیر نے ٹکٹ ہنی مون منانے کے لیے منگائے تھے، لیکن یہاں آیا وہ تنہا تھا۔۔۔۔صرف چار دن پہلے جب وہ دونوں، اس کے خیال میں دونوں، دوستوں، رشتہ داروں اور دوسری ساری اُلجھنوں سے آزاد چھ سات دن جے پور کے اس ہوٹل میں گزارنے کی اُمیدوں سے ہی سرشار تھے، اُس نے بس ایک زیادہ پیگ کی ترنگ میں پوچھا تھا۔''تم نے جے پور دیکھا ہے نا؟''

''ایک بار؟۔۔۔۔کئی مرتبہ!''

جواب سیدھا سادا تھا، اُس میں ہلکے سے سرور کے ساتھ پہلے کے سیرسپاٹوں کی یادوں کا تھوڑا سا، یا کچھ زیادہ، رومانس بھی شامل تھا۔

''پہلی بار پنچو کے ساتھ!'' اُس نے یاد کیا تھا۔

''نام تو اُس کا شری کانت ہے لیکن ہر شخص اُسے اس چھوٹے سے نام ہی سے بلاتا ہے''۔ کہنے کے بعد اُس نے سدھیر کے چہرے پر کچھ اور جاننے کی خواہش دیکھی تو بات بڑھائی۔

''لو تم تو اتنی جلدی بھول گئے۔۔۔۔یاد نہیں جب تم برات لے کر آئے تھے، وہ خوشیوں کے سمندر میں کس بری طرح ڈوبا ہوا تھا''۔

''یاد کیوں نہیں؟ مجھے چمٹا کر اس بری طرح بھینچا تھا کہ بھیا نے سنبھال نہ لیا ہوتا تو سہرے کی جانے کتنی لڑیں ٹوٹ گئی ہوتیں۔۔۔۔اور پھر۔۔۔۔پھر۔۔۔۔بھرے منڈپ میں اُسے تمھیں چمٹا لینے سے بھی بڑی مشکل سے روکا جا سکا تھا۔۔۔۔''

''اُس نے یہ ہونے کیوں دیا؟'' کئی نشے ایک ساتھ مل گئے تھے۔

''اور دوسری بار۔۔۔۔؟''

''دوسری بار؟'' وہ سوچ میں پڑ گئی کس کا نام لے۔

''ہوں'' اُس نے کہا۔ ایک بار پھر ''دوسری بار'' دہرایا۔۔۔۔نام یاد نہیں

آ رہا تھا، یا شاید فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کس کا نام لے۔

''چھوڑو بھی۔ کوئی بات نہیں، کیوں پریشان کرتی ہو اپنے آپ کو؟'' اس نے کہا تھا۔ جملے کا انداز نہ سپاٹ تھا نہ کسی گہرے جذبے کی آنچ تھی اس میں۔

اُسی دن شام کی چائے ساتھ ساتھ پیتے ہوئے وہی جملہ جو اُس نے صبح کہا تھا، اور کچھ ایسا تھا بھی نہیں کہ کوئی بھول جاتا، کچھ اس انداز سے دہرایا جیسے ایک دم یاد آ گیا ہو۔

''چاچی تو دو دن میں پریشان ہو گئیں۔''

''چہیتی جو ٹھہری اُن کی'' اس نے کہا۔ ''دو بار منٹو آ چکا ہے صبح سے، کہلایا ہے کپڑے اور زیور لے کر چار چھے دن کے لیے آ جاؤں۔''

''کوئی شادی بیاہ ہے؟''

''ہے تو۔۔۔ برسوں کا میل جول ہے، سب ہی تو تھے شادی میں، تم سے ملایا نہیں کیا کسی نے؟

''ضرور ملایا ہوگا، بہت سوں کو پچھوایا تھا، اتنے سارے تو لوگ تھے، بھلا ایک بار کی ملاقات میں کوئی ہر ایک کا نام اور صورت کیسے یاد کر لے؟'' جملہ پورا کرتے ہی اُسے یاد آیا کہ نام اور صورت کی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کے جملے میں کوئی اُتار تھا نہ چڑھاؤ۔ اس نے چائے کا لمبا سا گھونٹ پیٹ میں اتار لیا تھا۔ پیالی خالی ہو گئی تھی۔

ٹھنڈی ہوا جو چہرے کو شاداب بنائے ہوئے تھی، کسی اور طرف نکل گئی۔

اُسے سوچنے میں مشکل سے دو تین ہی منٹ لگے۔

''کوئی بات نہیں، اچھا ہے تم چلی جاؤ نہیں تو بے کار بور ہو گی۔ کمپنی کی میٹنگ جانے کیوں پرسوں سے کی جا رہی ہے۔ پہلے تو مارچ کے شروع میں ہونے والی تھی۔ فون نہیں آیا تھا صبح؟''۔ اُس نے پارل کو جسے ہر ایک مُون کہتا تھا، اُسی طرح دیکھا جیسے پچھلے ہفتے سے دیکھتا آیا تھا، شادی کے بعد سے۔ مٹھاس گھلی تھی اس کی نظروں میں۔ لگتا تھا آنکھوں سے شہد ٹپک رہا ہو۔

اس مٹھاس نے راستہ دکھایا۔ وہ ٹھنٹھنائی۔ ''تو تم جے پور نہیں دہلی جاؤ گے۔''
چائے کی پیالی جو ہونٹوں تک آنے ہی کو تھی اُس نے پرچ میں رکھی اور اُسے اس طرح دیکھا جیسے بڑا دُکھ ہو رہا ہو۔۔۔۔

پیالی خالی تو پہلے ہی ہو چکی تھی۔

اگلے دن اُس نے بتایا۔ 'ٹکٹ واپس کر دیے ہیں''۔

اُس میں کچھ بھی غلط نہ تھا۔

''پھر وہاں سے۔۔۔۔'' آخری لفظ تک آتے آتے اسے احساس ہو گیا کہ جملہ گڑبڑا رہا ہے، اِس لیے '' سے'' مُنہ میں گول گول چکر لگا کر کچھ ایسا بن گیا کہ وہ خود بھی اُسے ٹھیک سے سُن نہ سکا۔ اُس نے جملہ اس طرح پورا کیا جیسے سب بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔۔۔ ''معلوم نہیں میٹنگ کتنے دن چلے۔ یہ بھی نہیں معلوم دلّی میں ہے کہ گڑگاؤں میں یا بمبئی میں۔'' اُس نے سارے راستے بند کر دیے۔

موبائل سے اُسے چڑ تھی اور اُس کے پاس تھا نہیں۔

اُس نے اپنی بات یوں تو دو ہی جملوں میں پوری کی تھی، لیکن یہ دو جملے نہیں کئی ٹکڑے تھے جو ایک دوسرے کو آگے پیچھے دھکا دے رہے تھے۔

''میری فلائٹ پرسوں صبح کی ہے''۔

''تو مَیں کل شام میں گھر چلی جاؤں؟''

''اور نہیں تو کیا۔ یہاں رہ کے کیا کرو گی؟''

تھا تو یہ جملہ سیدھا سادا لیکن اِس میں کچھ کچھ طنز بھی تھا۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ ٹیڑھا پن اُس کا اپنا ڈالا ہوا تھا یا آپ ہی آپ شامل ہو گیا تھا۔

گھر جانے کی خوشی میں طنز کے احساس کی یہ لہر مُون کے پاس سے بھی نہیں گذر سکی تھی۔

اُسی وقت ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا جس نے جسم کے اندر اور باہر کی گرمی،

چہرے اور گردن کے پسینے کے قطروں سے ٹکرا کر، ایک خوشگوار احساس پیدا کر دیا۔ تالا نہ کھول پانے سے پیدا ہونے والی اُلجھن کچھ کم ہو گئی اور وہ دیوار سے لگی آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ یہ کرسی دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے والوں کے لیے تھی۔ ہوٹل بھی معمولی نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں جب ہاتھ پوری طرح قابو میں ہوں گے تالا کھولنا آسان ہوگا، اس نے سوچا۔ نیند کا جھونکا آیا تو وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اُسے اپنی حالت پر تھوڑا سا افسوس بھی ہوا لیکن وہ بس ایسا تھا جیسے دماغ کے پاس سے گزر جانے والی لہر، اور بس۔

تھوڑی دیر بعد ہوش و حواس تقریباً بجا ہو گئے تو اُس نے تالا کھولنے کی ایک اور کوشش کی، لیکن وہ آواز پیدا نہ ہوئی جس کے بعد دروازہ کھل جاتا ہے۔ اُس نے چابی آنکھوں کے قریب لا کے اس کا نمبر پھر پڑھا، تالے کے نمبر پر نظر ڈالی۔ کوئی گڑبڑ نہ تھی۔ ایک بار پھر کوشش کی، ذرا زیادہ طاقت لگائی تو کچھ کھٹ پٹ ہوئی اور پھر یکایک کسی نے اندر سے دروازہ کھول دیا۔

''جی؟'' اُس نے کہا، بلکہ پوچھا۔ لہجہ میں تھوڑی سی حیرت تھی اور اتنی رات گئے اُس کے کمرے کے دروازے پر کھٹ پٹ سے تھوڑی سی اُلجھن۔

''آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''میں یہاں کیا کر رہی ہوں۔ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوں۔'' آواز سپاٹ تھی۔

''بھئی آپ آگئی ہیں تو ٹھیک ہے، لیکن مجھے اپنے کمرے میں تو داخل ہونے دیجیے۔'' سدھیر کی آواز اب بھی کچھ کچھ لہرا رہی تھی۔

''اوہ یہ بات ہے، معاف فرمائیں آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ یہ کمرہ آپ کا نہیں ہے۔'' اُس کی آواز میں کسی قسم کی خفگی نہیں تھی۔

''آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا یہ اکیس نمبر کا کمرہ نہیں ہے؟''

''ضرور ہے۔''

''تو یہ آپ کا کیسے ہوگیا؟۔ میں چوتھی منزل کے اس کمرے میں پچھلے دو دن سے رہ رہا ہوں۔''

''جی یہ پانچویں منزل ہے۔ پانچ سو انیس نمبر کا کمرہ۔'' وہ مسکرائی۔

جواب میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ ایسے قدموں سے جن میں اب لڑکھڑاہٹ نہیں بس ہلکی سی نا استواری رہ گئی تھی، لفٹ کی جانب بڑھنے لگا۔

صبح اس کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی۔ ایک سیٹ چائے، چار ٹوسٹ اور مکھن کے لیے فون کیا۔ کچھ سوچ کر دوسری فون کیا۔ ''چار سو انیس۔ چائے بیس منٹ بعد بھیجیے'' اُس نے کہا اور، بستر سے اُٹھ کر ایک انگڑائی لی اور سیدھے باتھ روم میں گھس گیا۔ شاور سے چہرے پر گرم پانی کی پہلی بوچھار پڑتے ہی اسے رات کا سارا واقعہ یاد آ گیا۔ شرمندگی کا احساس بھی ہوا لیکن جسم پر رقص کرتا ہوا پانی سب کچھ بہا لے گیا، اتنی دور کہ وہ گنگنانے لگا۔ شیو کیا، کپڑے تبدیل کیے اور باہر نکلنے کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا، اتنے میں چائے آ گئی۔

اپنے اس ایر کنڈیشنڈ کمرے میں بیڈ کی حالت دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔ شکنیں صرف ایک جانب تھیں۔ دوسری طرف کا تکیہ سلیقہ سے رکھا ہوا تھا۔ گلابی رنگ کے ملائم تکیہ پر بھی ایک شکن نہ تھی، ہلکی سی دوہر جس کے چاروں طرف سفید ریشمی گوٹ لگی تھی بس ایک طرف سے ذرا سی مسل گئی تھی۔ بار کا منظر، کمرہ نمبر پانچ سو انیس کے باہر جو کچھ ہوا تھا اُس کی یاد اور مون کا خیال جیسے ایک ساتھ اس کے دماغ میں داخل ہوئے اور ایک دوسرے سے اِس طرح اُلجھ گئے کہ اُس کے لیے اُنہیں الگ الگ کرنا ممکن نہ ہو سکا۔

چائے پیتے ہوئے اُس نے دوسری خالی پیالی کو دیکھا، تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا رہا، پھر اُس نے اُس ٹھنڈی سانس کو جو بہت ہی ہلکی سی آواز پیدا کرنے کے لیے جیسے اُس سے اجازت مانگ رہی تھی، گردن کی جنبش سے لوٹ جانے کا اشارہ کیا۔

اُسی وقت بیرے نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا اور بس ذرا دیر بعد، جواب

کا انتظار کیے بغیر، دبے قدموں اندر داخل ہوا۔ ٹرے اُٹھائی تو دو توس، مکھن کی ایک ٹکیہ اور چاروں جانب کے موتیوں کے وزن سے دوسری پیالی پر پہلے کی طرح پھیلی ہوئی جالی اُسے متوجہ کیے بغیر نہ رہ سکی۔ بیرے نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا ''کوئی اور کام'' اور اُس نے بھی اُسی طرح جواب دیا'' کچھ نہیں''

بیرے کے چلے جانے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پرفیوم کی شیشی اُٹھائی، تھوڑی دیر تک اُسے دیکھتا رہا اور پھر کھولے بغیر واپس اپنی جگہ رکھ دی۔ کمرہ بند کیا اور لفٹ کا سہارا لینے کے بجائے ایک ایک زینہ چڑھنے لگا، دھیرے دھیرے۔

میں خوش ہوں یا اُداس؟ اُس نے سوچا لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا تو زینہ پر ہی رُک کر سوچنے لگا۔ اب بھی کوئی جواب نہ ملا تو نیچے سے کسی کے تیزی سے اوپر آنے کی آواز سُن کر آہستہ آہستہ قدم بڑھانے لگا۔ بیرا تھا، دونوں ہاتھوں میں چائے کی ٹرے سنبھالے ہوئے۔ اُس نے مجھے بے وقوفوں کی طرح زینہ پر کھڑے ہوئے نہیں دیکھا، یہ سوچ کر اُسے اطمینان ہوا۔

دروازے کی گھنٹی اُس نے بہت دھیرے سے دبائی، صرف ایک بار۔ دروازہ کُھلا۔ وہی خاتون سامنے کھڑی تھیں، رات ہی کی طرح سفید ساری میں ملبوس، چہرہ اسی طرح میک اپ سے عاری۔ اسے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی لیکن یہ بھی نہیں کہ سب بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس ہوا ہو۔ بہت کچھ ویسا نہیں ہے جیسا ہونا چاہیے تھا۔ شاید یہ محض احساس ہو، اُس نے سوچا۔

پچھلی رات کا واقعہ نہ ہوا ہوتا، یا وہ جو اس کے اِس شہر کے لیے اکیلے ہی روانہ ہونے سے قبل ہوا تھا، یا وہ اجنبی نہ ہوتی یا اجنبی ہوتی بھی تو اس نے اسے غیر مستحکم قدموں سے رات کے سناٹے میں اپنے کمرے کے سامنے سے واپس جاتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو شاید اُسے سب کچھ اس طرح اَٹ پٹا نہ لگتا۔ لیکن اس میں ایسا اَٹ پٹا کیا ہے؟ وہ اس کا انتظار تو کر نہیں رہی ہوگی اور وہ خود بھی سج بن کر نہیں آیا تھا، حد یہ ہے کہ اُس نے اپنی قمیص اور رومال پر پرفیوم تک نہیں لگایا تھا۔۔۔ بہت سی باتیں جو کسی نہ

کسی طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں، اُسے ایسی لگ رہی تھیں جیسے ایک دوسرے سے قطعاً غیر متعلق ہوں۔

وہ آیا تھا رات کے واقعے پر اظہار افسوس کرنے لیکن اس ذہنی کیفیت نے جیسے اس کی گویائی چھین لی تھی۔ اس کی آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں لیکن ایسا کچھ اسے نظر نہیں آ رہا تھا جسے وہ کسی سلسلے سے دماغ کے پردے پر جما سکے۔

خاتون نے دروازے کا دوسرا پٹ بھی دھیرے سے کھولا۔ بدن چراتے ہوئے پیچھے کی طرف ذرا سی کھسکی اور آہستہ سے بولی۔

''تشریف لائیے''۔

''تشریف رکھیے''

وہ کرسی پر بیٹھنے لگا تو خود بھی سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

ابھی وہ اِدھر اُدھر اور کبھی کبھی نظریں چرا کر اُس کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کافی پسند کریں گے یا چائے؟''۔

سدھیر نے اب ذرا غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ چہرے پر خوشی تھی نہ غم۔ بس ایک ہلکی سی اُداسی کا احساس ہوتا تھا۔۔۔ اُس نے اُسے اپنے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے دیکھا تو آنکھیں نیچی کر لیں اور بالوں کی اس لٹ کو جو کان کے پاس پنکھے کی تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہی تھی، پیچھے کے بالوں میں دبا دیا۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ مناسب الفاظ کی تلاش ابھی جاری تھی۔۔۔ اور اِس تلاش میں اُسے یہ بھی خیال نہیں آیا تھا کہ اُس سے کسی نے کچھ پوچھا ہے۔۔۔ اُسی وقت اجنبی خاتون نے، جو اَب پوری طرح اجنبی بھی نہیں رہ گئی تھیں، اپنا جملہ دہرایا۔ بس دو ایک لفظ اِدھر کے اُدھر ہو گئے تھے۔

''آپ چائے لیں گے یا کافی؟''۔

''جی شکریہ، میں نے چائے ابھی پی ہے''۔

''پھر بھی ۔۔۔۔ چائے تو میں نے بھی تھوڑی دیر پہلے ہی پی ہے''۔

''تو پھر کافی ۔۔۔۔ ویسے ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ تھوڑی دیر بعد منگا لیجئے گا؟''

یہ بات اس نے کہہ تو دی لیکن فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کے پس پشت اپنے قیام کو طول دینے کی خواہش تھی یا وہ چائے اور کافی کے درمیانی وقفے کو بڑھانا چاہتا تھا۔

اتنے میں اُس نے خاتون کو دیوار کی ٹک ٹک کرتی گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے دیکھا۔

''آپ کو کہیں تشریف لے جانا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

وہ شرمائی۔ ''جی یہ میری عادت ہے''۔

''اوہ''۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''تب تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔'' جملہ پورا کرنے سے قبل ہی اُسے اندازہ ہوگیا کہ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ لیکن تیر نکل چکا تھا۔

''وقت تیزی سے گزر جاتا ہے؟'' اس جملے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

یکایک اُسے احساس ہوا کہ پچھلے کئی دنوں سے اُسے بھی کچھ کچھ یہی محسوس ہو رہا ہے اور ممکن ہے کل رات میں 'بار' کا تجربہ اسی احساس کا نتیجہ رہا ہو، وقت کی سُست رفتاری کا، اور اُس نے سارا الزام اس یقین پر کہ شراب اُس پر زیادہ اثر نہیں کرتی، خواہ مخواہ تھوپ دیا ہو۔

خاتون نے پوچھا ''آپ کا قیام چوتھی منزل پر ہے؟''۔

یہ شاید اُس کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش تھی۔

وہ جیسے کھوئی ہوئی دُنیا سے لوٹ آیا۔

''جی ہاں ۔۔۔۔ آپ کے کمرے کے بالکل نیچے''

''یہ بھی عجب اتفاق ہے'' اُس نے کہا۔ آہستہ سے، جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہو۔

ویسے اس سوال کا جواب تو اُسے معلوم تھا، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ معلومات میں اضافہ کرنا اُس کا مقصد بھی نہیں تھا۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ برف کسی طرح پگھلے لیکن کچھ اس طرح کہ گرمی کا احساس پیدا نہ ہو۔ خاموشی اور وہ بھی ایسی جس میں تھوڑی سی افسردگی شامل ہو، کبھی کبھی خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایک تجربہ ہوا تھا اُسے اسی قسم کا جو آج سے قبل کبھی یاد بھی نہ آیا تھا۔

اس خاتون کے سوال اور سوچتی ہوئی خاموشی کو کسی کوشش کے بغیر پڑھ لینے نے سدھیر کو پھر سے کمرے کے ماحول میں پہنچا دیا اور اُس نے وہ بات شروع کی جس کے لیے وہ تھوڑی دیر قبل الفاظ تلاش کر رہا تھا۔

''اصل میں کل رات۔۔۔۔''

وہ ہنسی۔ ''ارے آپ کو اب تک یاد ہے، بھول بھی جایئے۔ زندگی میں اس طرح کی باتیں کبھی کبھی ہو جاتی ہیں۔ اُنہیں یاد رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔''

اُس نے سدھیر کے چہرے پر نظر ڈالی، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کا ذہنی تناؤ کچھ کم ہوا یا نہیں۔ سکون کی ایک پرت تو ہے، اس نے سوچا، لیکن شاید بہت پتلی سی اور سب کچھ ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ وہ اُسے پچھلی رات کے واقعے کا اثر سمجھ رہی تھی اور بس۔۔۔۔ ایک اچھے خاصے شریف انسان کا معمولی سی بھول چوک کے سبب بلاوجہ پریشان رہنا اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا، اِس لیے اُس نے زخم کو چھیڑے بغیر ایک پھایا رکھا۔

''میں خود ایک بار۔۔۔۔''

''آپ کو بھی اس طرح کی غلط فہمی ہو چکی ہے'' اُس کے لہجے میں خاصا سکون تھا، جو چہرے پر بھی جھلکنے لگا تھا۔

اُس نے بات بڑھائی ''لیجیے ہم لوگ اب تک ایک دوسرے سے متعارف بھی نہیں ہوئے۔''

''تعارف تو کل رات ہی ہو گیا تھا''۔ وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں ہلکی سی

شرارت بھی تھی۔ اسے یہ دونوں باتیں اچھی نہیں لگیں اور اُس نے خاموشی سے اپنی سرزنش بھی کی۔ اور اُن دونوں احساسات کو خود پر چھا جانے سے روکنے کے لیے موضوع یکایک تبدیل کر دیا۔

''مجھے لوگ شبنم کہتے ہیں''

''شبنم!''

''شبنم رحمان۔۔۔۔اور۔۔۔۔''اُس نے اپنے مخاطب کی طرف دیکھا۔

''سدھیر''

''صرف سدھیر''

''جی نہیں، سدھیر خاستگیر۔''

''اچھا نام ہے۔ موسیقی ہے اِس میں''

وہ مسکرایا لیکن اُسے یہ خیال بھی ہوا کہ ممکن ہے یہ اشارہ ہو کہ رات کے واقعے کی معافی تلافی ہو چکی، رسمی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی تعارف بھی ہو چکا۔ اب کیا رہ گیا ہے۔ تشریف لے جایئے (یہ بات ہے تو اس نے دِل ہی دِل میں کہا ہو گا۔ اب دفعان بھی ہو)۔ اِس خیال نے اُسے اُداس کر دیا لیکن پھر کافی کا آرڈر یاد آ گیا۔ اس وقت کافی کچھ زیادہ ہی سکون بخش ثابت ہو گی، بفرضِ محال اُس نے اس طرح کی کوئی بات گھما پھرا کر کہہ بھی دی اور وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا تو اُسے بیرے کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ وہ کہے گا تو کچھ نہیں لیکن سوچے گا ضرور کہ کیا ہوا، کیا دونوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا کہ اُس نے شبنم کی پیش کش ٹھکرا دی۔ اس بات کا خیال ضرور رہے گا اُسے۔ اُس نے خود کو تسلی دی۔ شبنم ایسی نفیس اور شائستہ عورت بیرے کو اِس طرح کی بات سوچنے کا موقعہ ہرگز نہ دے گی۔ اُس نے خود کو ایک بار پھر اطمینان دلایا۔

خاموشی ذرا طویل ہو گئی ہے اور اس کی ذمہ دار شاید وہی ہے، شبنم نے سوچا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ''آپ یہیں ہیں نا؟''

''جی، جی میں۔۔۔۔سوچ رہا تھا'' اس نے رُک رُک کر کہا تاکہ سوچنے کے

لیے اُسے کچھ وقت مل جائے۔'' سوچ کیا رہا تھا۔۔۔۔بس یہی کہ اس طرح کی حرکت میں نے کسی دوسری خاتون کے کمرے کے دروازے پر کی ہوتی تو کیا ہوتا''۔

''ارے آپ اب بھی کل رات کے واقعے کو بھول نہیں سکے۔۔۔۔کچھ بھی نہ ہوتا، علاوہ اس کے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو چار سخت سُست جملے کہہ دیتی یا۔۔۔۔اس نے اپنی زبان کو بریک لگایا۔اُسے حیرت تھی کہ ایسا خیال الفاظ کی شکل کیسے اختیار کرنے جا رہا تھا، اور وہ بھی اُس کی زبان پر۔

اتنے میں دروازہ پر، جو تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، کسی نے ٹک ٹک کی اور تقریباً فوراً ہی بیرا داخل ہوا، کافی کی ٹرے ایک ہاتھ میں سنبھالے ہوئے۔

سدھیر کی ملازمت ایسی تھی کہ اُسے شہر شہر جانا پڑتا تھا۔اچھے اور اوسط درجے کے ہوٹلوں کا اُسے خاصا تجربہ تھا۔اپنی موجودگی کا پہلے سے احساس دلائے بغیر بیرے کمرے میں داخل نہیں ہوتے، یہ اُسے خوب اچھی طرح معلوم تھا۔لیکن اُس کا اس طرح داخل ہونا کہ کمرے کے بجائے جیسے ٹرے دیکھ رہا ہو، اُسے کچھ عجیب سا لگا۔یہ تجربہ اُس کے لیے نیا تھا۔لیکن وہ سمجھ گیا، مسکرایا بھی، کچھ اُداس بھی ہوا کہ ہنی مون کے لیے خریدے ہوئے ٹکٹ سے وہ اکیلا ہی آیا تھا اور اس کمرے میں تو کچھ ایسا تھا بھی نہیں۔کوئی یکایک بھی داخل ہو جاتا تو دونوں ایک دوسرے سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہی ملتے۔

شبنم کا اشارہ پاتے ہی بیرے نے چھوٹے لیکن خوبصورت سے اسٹول پر ٹرے رکھ دی تو اُس نے اپنی کرسی آہستگی سے میز کی طرف کھسکائی۔سدھیر نے بھی یہی کیا۔

کافی کے دو دو گھونٹ لینے کے باوجود دونوں ہی خاموش تھے۔ممکن ہے یہ خاموشی اُنہیں کاٹ رہی ہو۔لیکن اُنہیں اس کا واضح طور سے احساس نہ تھا اور اگر اس سے زیادہ کچھ تھا بھی تو دونوں اُس سے بے خبر تھے۔

اب یہ خاموشی اُنہیں توڑنی ہوگی۔دونوں نے جیسے ایک ساتھ سوچا لیکن پہل

شبنم نے کی۔

''آپ جے پور پہلی بار تشریف لائے ہیں؟''

''پہلی بار تو نہیں لیکن اتفاق سے یہاں آنا کم ہی ہوا ہے، بس دو تین بار۔ ویسے یہ شہر مجھے پسند ہے لیکن کئی بار خواہش کے باوجود دوسری مصروفیات کے سبب پرچیز آفیسر کو بھیجنا پڑا۔''

اِس میں تھوڑا سا جھوٹ تھا۔ کمپنی میں اُس کی طرح کے کئی پرچیز آفیسر تھے اور یہ محض اتفاق تھا کہ یہاں آنے کی نوبت بس دو تین بار ہی آئی تھی۔

شبنم کی آنکھوں میں اُس کے بیان کے بارے میں کسی قسم کا شک نہ تھا اور ایسا کرنے کا کوئی سبب بھی نہ تھا البتہ ہلکا سا تجسّس ضرور تھا اور نہیں بھی تھا تو سدھیر کی اس خواہش نے جس سے وہ خود بھی پوری طرح واقف نہ تھا، کچھ ہونے یا کچھ نہ ہونے کے سلسلے کو ختم نہیں ہونے دیا تھا۔ لیکن سوال دوسری طرف سے ہو گیا۔

''یہاں آپ۔۔۔؟''

کافی تھے یہ دو لفظ گفتگو کے سلسلے کو طول دینے کے لیے لیکن وہ سب کچھ پہلی ملاقات میں بتا کر بعد کی ملاقاتوں کو موضوع کی تلاش میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش پر اُسے ہنسی آئی لیکن اُس نے اُسے جملے میں تبدیل کر دیا۔

''جی چھوٹا سا کام ہے، پورے ملک سے اچھی سے اچھی ساڑیاں چھانٹ کر ایکسپورٹ کرتا ہوں۔ دُنیا بھر میں ساری کا رواج بڑھ رہا ہے۔''

شبنم مسکرائی لیکن اُس نے یہ سوچا کہ ساری کی یہ بات طول کھینچ سکتی ہے اِس لیے اس پر روک لگانے کی کوشش کی ''اب تو ورک کلچر بڑھ رہا ہے، عورتیں آفسوں میں شلوار قمیص پہنتی ہیں، بہت سی تو جینز بھی۔۔۔۔''

سدھیر سمجھ تو گیا لیکن اس نے ہار نہیں مانی۔ ایک کوشش اور کی۔ ''جی ہاں یہ تو ٹھیک ہے، لیکن لوگوں کے پاس پیسہ ہوتا ہے تو سیر سپاٹا بھی ہوتا ہے'' اُس نے اپنی دلیل زیادہ آگے نہیں بڑھائی لیکن اُس کی ساری کی طرف دیکھا تو شبنم کو اُس میں ٹن ٹن کرتی

ہوئی خطرے کی گھنٹی سُنائی دی اور اُس نے دروازہ پاٹوں پاٹ بند کر دیا۔

''آپ کا خیال درست ہے۔ کچھ لوگوں کو کپڑے خریدنے کا شوق بھی ہوتا ہے۔ کبھی مجھے بھی تھا، لیکن اب بالکل ہی نہیں ہے۔ اتنی بہت سی ساریاں پڑی ہیں کہ اُن میں سے کچھ کے پہننے کی تو شاید نوبت ہی نہ آئے۔'' اس نے کہا

سدھیر نے اُس دروازے کے بند ہونے کی آواز بھی سُنی۔ اسے ذرا سا اطمینان بھی ہوا۔ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ شہروں شہروں قیمتی ساریاں بانٹتا پھرے۔ لیکن اس امکان سے تھوڑا سا شرمندہ بھی ہوا کہ اُس کے دعوے کے باوجود ممکن ہے شبنم نے اُسے پرچیز آفیسر ہی سمجھا ہو۔ اس اُلجھن سے نکلنے کے لیے اُس نے وہ بات جو رَو میں کسی اور طرف نکل گئی تھی، اس وقت بے موقع ہونے کے باوجود جوڑ دی۔

''جے پور مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کبھی کبھی کام ختم ہونے کے بعد بھی چار چھے دنوں کے لیے رُک جاتا ہوں''۔

وہ مسکرائی، جیسے بات کی تہہ تک پہنچ گئی ہو اور بولی ''میں اِن ہی دنوں بس سات دن کے لیے۔۔۔۔''

اُس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ ہر سال جے پور ہی آتی ہے۔ سدھیر نے اس بارے میں پوچھنا چاہا لیکن اِس خیال سے کہ اگلی ملاقات میں باتوں باتوں میں معلوم کر لے گا، ارادہ بدل دیا۔ اُسی وقت اُسے خیال آیا کہ ''اِن دنوں'' کہتے وقت شبنم کے چہرے پر ہلکی سی اُداسی چھا گئی تھی، جس پر پردہ ڈالنے کی اس کی کوشش پوری طرح کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ سدھیر خود بھی اس معمّے میں اُلجھ گیا تھا، پھر بھی اُس کی یہ اُلجھن اس ذہنی کیفیت سے بہتر تھی جس کا سلسلہ ہنی مون کا پروگرام یکایک ختم ہونے پر پانچ چھے دن قبل شروع ہوا تھا۔

سدھیر کا خیال تھا کہ رُخصت ہوتے وقت، رسماً ہی سہی، وہ اُسے دوبارہ آنے کی دعوت ضرور دے گی، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اُس نے کسی طرح کی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا نہ ناپسندیدگی کا۔ دروازہ کے پٹ فوراً ہی بند ضرور کیے تھے لیکن آہستگی

سے، کسی آواز کے بغیر۔

اگلے چار دن کے قیام کے دوران لاؤنج، لان اور لفٹ میں شبنم کا سامنا تو کئی بار ہوا لیکن بات رسمی مسکراہٹوں کے تبادلے یا سروں کی خفیف سی جنبش سے ذرا بھی آگے نہ بڑھی۔

سدھیر کو شبنم میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن گھر سے دُور، کسی ایسے مقام پر جہاں لوگ ڈھرّے کی زندگی سے چھٹکارہ پانے، کاروبارِ حیات میں خود کو دوبارہ جھونک دینے کے لیے تیار کرنے یا زندگی میں تھوڑی سی رنگینی بھرنے کے لیے آتے ہیں، اس کے برتاؤ نے جس میں کوئی اُتار تھا نہ چڑھاؤ، اُس کے دل میں تجسّس کا ایک عنصر ضرور پیدا کر دیا تھا۔

اس تجسّس کی سیرابی کچھ ایسی مشکل نہ تھی، اور خاص طور سے اس طرح کے ہوٹل میں جہاں بخشش کے اونٹ پر بیٹھ کر محفوظ پناہ گاہ میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنی خواہش، جو کچھ ایسی شدید بھی نہ تھی، اِس طرح پوری کرنا جس میں تھوڑی سی کمینگی بھی شامل تھی، اُسے دونوں کی توہین معلوم ہوئی، اپنی بھی، شبنم کی بھی۔

اُس کی عادت تھی کہ چیک آؤٹ کرنے سے ایک دن پہلے تک کے بلوں کی ادئیگی چیک سے کرنے کے بعد باقی رقم نقد ہی ادا کرتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں اس طرح اسے احساس ہوتا تھا کہ زیرِ باری کم ہوئی ہے اور چھوٹی موٹی خریداری کے لیے اس کے پاس بہت سے پیسے بچ گئے ہیں۔۔۔۔ کاؤنٹر سے یہ پوچھے جانے پر کہ بل تیار ہے، کیا کمرے میں بھیج دیا جائے وہ خود ہی ریسپشن پر چلا آیا تھا اور چیک لکھ ہی رہا تھا کہ کسی بیرے نے اکاؤنٹینٹ سے کہا تھا۔

''مس شبنم کا بل بھی بنا دیجیے۔ وہ کل چیک آؤٹ کریں گی''۔

شبنم کے نام کے ساتھ ''مس'' سُن کر اُسے خیال آیا کہ اُنہوں نے خود کو شاید مسز بتایا تھا، یا شاید نہ بتایا ہو اور میں نے آپ ہی آپ فرض کر لیا ہو، اس نے سوچا۔

اس کا جی چاہا کہ ہوٹل سے رخصت ہونے سے قبل ایک بار شبنم سے ملاقات ضرور کر لے۔لیکن کیسے؟ کیا کہے گا وہ ان سے؟ اُس دن تو ایک بہانہ تھا۔اس وقت تو یہ بہانہ بھی نہ ہوگا۔ یہ کہنا کہ میں کل جارہا ہوں مناسب ہوگا؟ اُس نے سوچا۔اور اگر اُس نے جواب میں کہہ دیا ''اطلاع دینے کا شکریہ۔اور کچھ؟'' تو وہ اس خیال سے بھی محروم ہوجائے گا کہ وہ اس کے بارے میں شاید کبھی سوچے، بس یوں ہی، کسی جذبے اور احساس کے بغیر، جس کی اُسے اُمید تھی نہ خواہش۔۔۔۔ ان خیالات کا یہ سلسلہ اُس وقت ٹوٹا جب ٹیکسی پارکنگ سلاٹ میں داخل ہورہی تھی۔

عادت کے مطابق روانگی سے ایک روز قبل اُس نے کچھ چھوٹی بڑی چیزیں خریدیں، دو چار اپنے اور باقی گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے۔ان میں چند ایسی بھی تھیں جن کے لیے جے پور مشہور ہے، جیسے پاؤ بھر روئی کی دُھنی ہوئی دو دلائیاں اور دروازوں کے چار ایسے پردے جن کے دائیں بائیں اور نیچے چھوٹی چھوٹی خوبصورت گھنٹیاں لگی ہوتی ہیں اور اُسے ہاتھ لگاتے ہی ٹن ٹن کی دھیرے دھیرے پھیلنے والی میٹھی میٹھی سی آواز فضا میں بکھر جاتی ہے۔

لفٹ میں شبنم پہلے ہی سے موجود تھی۔سدھیر اور پیچھے پیچھے سامان سے ٹھسے پولی تھین کے دو بڑے تھیلے لیے وہ اور بیرا داخل ہوئے اور اُن پر اُس کی نظر پڑی تو وہ خوش دلی سے بولی۔''بہت خریداری کرڈالی، کیا ہوٹل سے دل بھر گیا؟''

اُس کے دل نے ہوٹل کے معنوں کو وسعت دی اور اُس کو کچھ ایسی نظر سے دیکھا جس میں کسی قسم کی اُمید کے چراغ تو روشن نہ تھے لیکن نا اُمیدی بھی نہ تھی۔

''آج نہیں، کل۔۔۔۔کل شام میں۔۔۔۔''

اُسی وقت اسے خیال آیا کہ شبنم نے وہ بات تو نہیں پوچھی تھی جس کا اُس نے جواب دے دیا ہے۔لیکن شاید وہ یہی پوچھنا چاہتی تھی۔اُس نے سوچا اور اپنے خیال کو مزید تقویت دینے کے لیے پہلے آنکھوں ہی آنکھوں میں اور پھر الفاظ کا سہارا لے کر

پوچھ لیا۔

''اور آپ ۔۔۔۔؟''

''میں؟'' اُس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ سوچ رہی ہے۔۔۔۔کیا جواب دے۔

''ابھی طے نہیں کیا ہے'' لہجہ سپاٹ تھا۔

اُمیدوں پر، جنہیں اُمید کہنا بھی مناسب نہ ہو، اوس ایسے بھی پڑتی ہے۔

اتنے میں چوتھی منزل آ گئی۔ سدھیر لفٹ سے باہر نکلا۔ بیرا بھی باہر آ گیا۔ دھیرے دھیرے بند ہوتے ہوئے دروازے سے اُس نے شبنم کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر خوشی تھی نہ کسی غم کا کوئی سایہ۔

تھیلے کو ایک کونے میں رکھ کر بیرا چلا گیا تو اُس نے خود کو بستر پر پھینک دیا، بالکل اس طرح جیسے کوئی غیر ضروری سامان پھینک دیتا ہے۔ اُسی وقت ریسپشن پر بیرے کا جملہ اُس کی یادوں میں چمک اُٹھا اور تجسس نے تکان اور بے دلی کی جگہ لے لی۔

اسی طرح لیٹے لیٹے اُس نے مسہری کے سرہانے کا گھنٹی کا بٹن ٹٹولا جو دوسری کوشش میں مل گیا اور اُس نے دھیرے سے اُسے دبا دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک دروازے پر نظریں گاڑے رہا۔ کچھ نہ ہوا۔

اُس نے بٹن دوبارہ دبایا، کسی قدر زور سے اور فوری طور سے اُس پر سے اُنگلی ہٹائی بھی نہیں۔ بمشکل پندرہ بیس سیکنڈ بعد بیرا کمرے میں داخل ہوا، گھبرایا ہوا، کچھ پریشان سا۔ ہانپتا ہوا۔

اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔۔۔۔اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پتلون کی پیچھے کی جیب سے پرس نکالا اور اُس میں سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''کیا لانا ہے ساب؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔تم رکھ لو''۔

بیرا چکرا گیا۔۔۔۔بیس پچیس روپے تو ہر دن مل ہی جاتے تھے، اور صاحب جائیں گے تو کل، پھر یہ سو روپے۔ ابھی وہ اس گتھی کو سلجھانے میں ہی لگا ہی تھا کہ کئی بار

کی کوشش اور خود سے لڑنے جھگڑنے کے بعد سدھیر کے مُنہ سے صرف ایک لفظ نکلا۔

''مس شبنم؟''

ہوٹل کے کمروں کے باہر ہی باہر چکّر لگاتے ہوئے بیرے تھوڑے ہی دنوں میں اندر کی دُنیا بھی دیکھ لیتے ہیں۔ وہ سب کچھ سمجھ گیا۔

''شبنم میم صاحب۔ آپ کے کمرے کے اوپر، جو پانچویں منزل میں ہیں؟''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس سر ہلا دیا۔

''ہر سال آتی ہیں''۔

سدھیر نے اُس کی طرف دیکھا، اِس اُمید میں کہ شاید وہ کچھ اور بتائے۔ لیکن وہ خاموش تھا۔ پانچ چھے برس سے طرح طرح کے ہوٹلوں میں قیام کرتے کرتے وہ بھی بیروں کی ایک ایک نس سے واقف ہو چکا تھا۔ اُس نے پرس سے سو کا ایک اور نوٹ نکالا اور اُس کی طرف بڑھا دیا۔

''دس سال سے برابر آ رہی ہیں۔ کوئی سال خالی نہیں جاتا۔۔۔۔ پہلی بار آئیں تو نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ پھول کی طرح ہر وقت کھلی رہتی تھیں۔ شاید اسی سال ۔۔۔اُن کے شوہر بھی بہت خوبصورت تھے۔ لیکن۔۔۔۔''

بیرا ''لیکن'' کہہ کر خاموش ہو گیا تو سدھیر نے اشارہ سمجھ لیا اور ایک اور نوٹ پرس سے نکالا۔

''ٹریجڈی ہو گئی تھی ان کے ساتھ، بہت بڑی ٹریجڈی۔۔۔۔ چوتھے ہی دن جانے کیا ہوا کہ صاحب بالکنی سے گر گئے اور۔۔۔۔''

''اوہ!'' سدھیر کے منہ سے صرف ایک لفظ نکلا۔ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ بیرے کا بیان اس قدر اندوہناک موڑ لے سکتا ہے۔

''اُس کے بعد ہر سال انہی دنوں میں آتی ہیں۔ یہ کمرہ،'' اُس نے سدھیر کی طرف دیکھا۔ ''اس بار کچھ ایسی مجبوری تھی کہ خالی ہونے میں دیر ہو گئی اور بعد میں آپ کو دے دیا گیا، خالی ہونے والے دن ہی۔ یہ ٹریجڈی ۲۲ر فروری کو ہوئی تھی۔ ہر سال

اگلے دن لوٹ جاتی ہیں، پانچویں دن۔ کل پانچواں دن ہے''۔

بیرا خاموش ہو گیا۔ سدھیر نے سوچا کہ شاید وہ پرس کو ایک اور بار کھلتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن بیرے کو اس کی امید نہ تھی اس لیے اُس نے اپنا تار جوڑا۔

''کل بل بنانے کے لیے کہا تھا لیکن آج فون کر دیا ہے کہ ابھی دو چار دن اور رکیں گی۔۔۔۔ جانے کیوں؟

سدھیر کا جی چاہا کہ بیرے سے کہہ دے ''بس۔ بہت ہو چکا''۔ لیکن سارے پردے تو اُٹھ چکے ہیں، شاید ایک آدھ رہ گیا ہو، اس نے سوچا، وہ بھی کیوں نہ اُٹھ جائے۔

بیرے نے اُس کی آنکھوں میں اشتیاق کی جھلک دیکھی تو خود کو نہ روک سکا۔

''ان دس برسوں میں بیروں کے علاوہ آپ شاید پہلے آدمی ہیں جو اُن کے کمرے میں گئے ہیں۔ اس بار تو ایک آدھ بار باہر نکلیں بھی، نہیں تو کمرے ہی میں بند رہتی تھیں۔ چائے، کھانا وہیں منگا لیتی تھیں۔۔۔۔ لیکن بالکنی پر جو اَب جالی سے بند کر دی گئی ہے، کبھی کبھی نظر آ جاتی تھیں۔''

اُسی وقت سدھیر نے اشارہ کر کے اُسے خاموش کر دیا، یہ سوچ کر کہ اب کلی پھندنے ہی لگنے کو رہ گئے ہیں۔

بیرے کی آنکھوں میں ہلکی سی مایوسی تھی۔ لیکن سدھیر نے اُس کا دل نہیں توڑا اور مسکراتے ہوئے ایک اور نوٹ اُسے دے دیا، ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہ اب اُسے کچھ اور نہیں سننا۔

ٹیکسی پورٹیکو میں کھڑی تھی۔ اُس کا سامان رکھا جا چکا تھا۔ سامان جاتے ہوئے دیکھ کر چوتھی منزل کے دوسرے دو بیرے بھی اُسے سلام کرنے کے لیے آ کھڑے ہوئے۔ اُس نے اُنہیں پچاس پچاس کے نوٹ دے دیے لیکن اُس کے اپنے بیرے کے نوٹ کا رنگ مختلف تھا۔

ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی تو اُس نے ہوٹل کو افسردہ نظروں سے دیکھا، ڈرائیور سے

باہر نکلتے ہی ڈرائیور کو اشارہ کیا تو کار دھیمی ہوگئی۔ اُس نے کھڑکی سے مُنہ نکالا۔ پانچویں منزل کا انیس نمبر کمرہ کچھ کچھ نظر آرہا تھا۔ وہ اسی میں ہوگی۔ اُس نے سوچا۔ اپنے زخموں کو کریدتی ہوئی، اُنہیں بھلانے کی کوشش کرتی ہوئی۔

ڈرائیور کی جانب دیکھے بغیر اس نے اسپیڈ بڑھانے کے لیے ہاتھ ہلایا۔ اور اپنے چہرے کو سامنے کے چھوٹے سے آئینے سے بچانے کے لیے آگے والی سیٹوں کے پیچھے ذرا سا جھک کر آنسو پونچھے۔

''آگے بڑھ کر مال روڈ لے لینا۔ ادھر بھیڑ بہت ہوتی ہے، ایئرپورٹ جلدی پہنچنا ہے'' اُس نے کہا اور مڑ کر ہوٹل کو ایک بار اور دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

■ ■

غلام گردش

اُس نے پنجوں کے بل اُچک کر لوہے کے گیٹ کا کُنڈا کھولا جس سے کھٹ پٹ کچھ زیادہ ہوئی اور میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اُسے گیٹ کا پٹ تھوڑا سا کھول کر اندر داخل ہوتے دیکھا، پھر دھیرے دھیرے اپنی طرف بڑھتے ہوئے اور اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

مجھے اُس کا اِس طرح آنا اچھا لگا کیوں کہ مجھ سے ملاقات کرنے کے لیے جو لوگ آتے ہیں وہ اس طرح داخل نہیں ہوتے۔ کاروں سے آنے والوں کے علاوہ باقی لوگ عام طور سے گیٹ سے پہلے ذرا سا رُک کر ایک بار اپنے کپڑوں پر نظر ڈالتے ہیں، گرد و غبار کا نشان ہو یا نہ ہو، پینٹ کی مہریوں اور شیروانی کے دامن اور سامنے کے اوپر والے حصّے کو رومال سے دھیرے دھیرے جھاڑنے، بالوں پر ہاتھ پھیرنے اور پھر اُسے کھول کر چہرہ صاف کرنے کے بعد تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہیں اور اندر داخل ہوتے ہی جھک جھک کر سلام کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے دالان میں بچھی ہوئی کرسیوں پر ادب سے بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ہلکی سی مسکراہٹ سے اُن کا خیر مقدم کرتا ہوں لیکن کھڑے ہو کر استقبال صرف اُن لوگوں کا ہوتا ہے جن کو کسی

نہ کسی سبب میں اس کا مستحق سمجھتا ہوں اور جو صوفوں پر بٹھائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور سے ذاتی سواریوں سے آتے ہیں۔

میرا صوفہ چوں کہ چبوترے پر رکھا ہوا ہے اور یہ چبوترہ زمین سے فٹ سوا فٹ اونچا ہے اس لیے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ گیٹ اور سڑک کے درمیان کی پکّی زمین پر لوگ کیا کر رہے ہیں لیکن یہ بچّی چوں کہ بہت چھوٹی تھی اس لیے میں اس کے چھوٹے چھوٹے پیر ہی دیکھ سکا تھا جن میں وہ ربر کی پرانی چپل پہنے ہوئے تھی۔ اُسے دیکھ کر میں نے یہ نہیں سمجھا تھا کہ وہ میرے پاس آ رہی ہے اور یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُسے مجھ سے کوئی کام ہو سکتا ہے۔

یوں تو دن خاصا چڑھ آیا تھا لیکن کہرے اور بادلوں نے سردیوں کے ان دنوں کو جو ویسے بھی چھوٹے ہوتے ہیں اور چھوٹا کر دیا تھا اور صُبحیں خاصی نیچے کھسک آئی تھیں۔ اگرچہ کمرے سے نکل کر لان میں میرے آ بیٹھنے کا یہ وقت نہیں تھا لیکن تھوڑی دیر قبل بادلوں کی پرت چیر کر سورج کی کرنوں نے اپنے پنکھ پھیلانے کا ڈھونگ رچنا شروع کیا تو میں بھی اس راس لیلا کا مزا لینے کے لیے کمرے سے باہر آ کر یہاں بیٹھ گیا تھا۔

اسے دیکھ کر میں سمجھا تھا کہ کسی ملازمہ کی بیٹی ہوگی اور ان کے داہنی جانب کے دوسرے راستے سے گھر میں چلی جائے گی یا پھر غلام گردش کی جانب جس کے چھوٹے چھوٹے کوارٹر پاس میں ہی بنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ نہ تو میرے گھر کے دروازے کی طرف بڑھی نہ غلام گردش کی جانب مڑی۔ اُسے اِس طرح اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر میں نے سوچا کہ شاید اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ڈانٹ کھائے بغیر کس طرح میرے سامنے سے کھسک جائے۔ وہ ذرا بڑی ہوتی تو میں اب تک اسے ڈانٹ چکا ہوتا لیکن ایک تو وہ بہت چھوٹی تھی اور دوسرے پلک جھپکائے بغیر مجھے گھورے جا رہی تھی اس لیے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں۔ چنانچہ میں نے ہاتھ سے غلام گردش کی طرف اشارہ کیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا تا کہ اُسے بھاگ جانے میں آسانی ہو لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو میں نے اُسے اس طرح دیکھا

کہ اُس کی سمجھ میں آجائے کہ اب اس کا یہاں ٹھہرے رہنا ٹھیک نہیں ہے لیکن اس کا بھی اُس پر کچھ اثر نہ ہوا تو میں نے بھنویں اُچکا کر اُسے تھوڑے سے غصہ سے دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں کیا آیا اور کیا نہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اپنے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ ظاہر کیے بغیر اُس نے کہا۔

''اماں نے تھوڑا سا تیل مانگا ہے!'' اپنی بات پوری کر کے وہ کٹوری کی طرف دیکھنے لگی جو اُس کے ہاتھ میں تھی۔

اس کا سوال سُن کر مجھے ہنسی آنے ہی والی تھی لیکن میں نے اپنے ہونٹ تک کھلنے نہ دیے اور چہرہ سنجیدہ بنا کر آنکھیں اس طرح گھمائیں جیسے پوچھ رہا ہوں کہ ''کون اماں؟'' اور ''میں تیل کہاں سے لاؤں؟''

''ہماری اماں،'' اس نے کہا اور غلام گردش کی طرف اشارہ کر کے بولی ''وہاں'' اس وہاں کے معنی تھے کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی اماں کہاں رہتی ہے۔

بھائی صاحب کے مکان کی پشت تو پتلی سی گلی کی جانب ہے لیکن دونوں گھروں کے ملازمین کے کوارٹر آمنے سامنے ہیں اس لیے نوکروں اور اُن کے بچّوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ بچّی ضرور بھائی صاحب کے یہاں کے کسی ملازم یا ملازمہ کی ہے اور چوں کہ بھائی صاحب ذرا سی بات پر ہنسنے لگتے ہیں اس لیے شاید اُسے معلوم ہی نہیں کہ غصہ کیا ہوتا ہے۔ لیکن یہ تو گیٹ کھول کر اندر آئی تھی، میں نے سوچا۔ اُسی وقت مجھے خیال ہوا کہ باہر کے راستے سے شاید اس لیے آئی ہو کہ اسی بہانے کچھ صورتیں اور ان دو تین چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں، جو راستے میں پڑتی ہیں، رکھی ہوئی چیزیں بھی دیکھ لے گی۔

میں نے اس لڑکی کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی جانے کیسے مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ یہ بھائی صاحب کے یہاں کام کرنے والوں میں سے ہی کسی کی بچّی ہے اور یہاں غلطی سے آ گئی ہے۔

میرا جی چاہا کہ اس بچّی سے جو بہت بھولی بھالی تھی کچھ اور باتیں کروں۔ اس لیے یہ بتانے کے بجائے کہ اُسے اس طرف نہیں بلکہ اُس طرف جانا چاہیے تھا، میں نے اُس سے پوچھا۔

''تیری ماں تیل کا کیا کرے گی؟''

''تیل کا؟''

''اور نہیں تو کیا میرا؟''

وہ ہنس دی، شاید سمجھی نہیں اور یہ اچھا ہی ہوا کیوں کہ جو الفاظ میرے مُنہ سے نکل گئے تھے، کوئی چاہتا تو اُن کا مذاق بھی اُڑا سکتا تھا، میرے سامنے نہیں، کیوں کہ ایسا کرنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا لیکن اس طرح کی باتوں کا مجھے علم ضرور ہو جاتا ہے، کسی کے بتائے بغیر بھی۔ عمر کے ستر بہتر برسوں میں بہت کچھ سیکھ لیا ہے میں نے۔

''ترکاری بنائیں گی۔'' اس نے کہا۔

مجھے ہنسی آ گئی اور میں نے اپنی ہنسی اس بار چھپائی نہیں۔ وہ بھی مسکرا دی۔

اُس کی مسکراہٹ مجھے اچھی لگی اور میں نے سوچا کہ چھیتن کو بلا کر اُسے تھوڑا سا تیل دلوا دوں لیکن اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ اس بچّی کو تیل دلوا دیا تو ممکن ہے وہ راستے میں گرا دے اور بعد میں یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس کی ماں کچھ نہ کچھ منگانے کے لیے اُسے ہر دوسرے تیسرے دن بھیجنے لگے اور بات پھیل گئی تو یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری نوکرانیاں یا نوکروں کی بیویاں بھی یہی کرنے لگیں۔ یہ عورتیں کچھ بھی کر سکتی ہیں۔ یہ سوچ کر میں نے اُس سے کہا۔

''اپنی ماں سے جا کر کہہ دو کہ اُنہوں نے کہا ہے تیل نہیں ہے''

اُس نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو ''تم تو ایسے آدمی نہیں لگتے ہو'' اور گیٹ کی طرف چل دی لیکن ہر دو چار قدم کے بعد وہ پلٹ کر مجھے دیکھ ضرور لیتی تھی۔ ممکن ہے سوچ رہی ہو کہ یہ بات میں نے یوں ہی کہہ دی ہے اور میں اُسے آواز دے کر بلا لوں گا۔ شاید اسی لیے گیٹ کا پٹ کھولتے ہوئے بھی اُس نے مجھے پلٹ کر

دیکھا، اس کے چہرے پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے چھیتن کو آواز دی اور اُس کے آنے کے بعد پہلی بات اُس سے یہی پوچھی کہ یہ کس کی لڑکی ہے اور کیا اس کے ماں باپ میں سے کوئی بھائی صاحب کے یہاں کام کرتا ہے۔

چھیتن نے گیٹ کی طرف دیکھا، جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو، لیکن اس کے چہرے سے حیرت زیادہ ظاہر ہو رہی تھی اور کچھ یاد کرنے کی کوشش کم۔ حیرت اُسے شاید اس پر تھی کہ میں اتنی سی بچّی کے ماں باپ کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہوں۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ میں اُس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے ہوں تو اُس نے پہلے ماں کا نام بتایا اور پھر باپ کا۔ لیکن اُس کی ماں کا نام میں اُسی وقت بھول گیا کیوں کہ گھروں میں کام کرنے والی عورتوں کے نام کچھ اِس قدر ایک سے ہوتے ہیں کہ اُنہیں یاد رکھنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی اور اِس کا کچھ فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے باپ کا نام البتہ مجھے یاد رہ گیا بلکہ سچ پوچھیے تو مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کیوں کہ وہ برسوں سے بھائی صاحب کے یہاں ملازم ہے۔ اسی کے نام کا ایک نوکر کئی سال پہلے ہمارے یہاں تھا اس لیے اُنہوں نے اُس کا نام بدل دیا تھا اور اب شاید اسے خود بھی نہ یاد رہ گیا ہو کہ اس کا اصلی نام کیا تھا۔

یہ باتیں سوچتے سوچتے میں قطعاً بھول گیا کہ میں نے چھیتن کو کیوں بلایا تھا لیکن جیسے ہی اُس نے پوچھا ''اور کوئی کام صاحب'' مجھے سب کچھ یاد آ گیا اور میں نے اُس سے کہا کہ کڑوے تیل کا آدھے کلو کا مُہر بند ڈبا خرید کر اُس کے یہاں دے آئے۔ میری بات سن کر چھیتن کو ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ میں اپنے ہاتھ سے کسی کو کبھی کچھ نہیں دیتا اور یہ کہ روپے پیسے عام طور سے اپنی جیب میں نہیں رکھتا۔

میری بات سُنتے ہی وہ مڑا لیکن ابھی تھوڑی دُور ہی گیا ہوگا کہ میں نے اُسے دوبارہ آواز دی اور جب وہ پاس آ گیا تو اُس سے کہا کہ تیل کے مہر بند ڈبّے کے بجائے اتنا ہی تیل پُل والی دوکان سے خرید کر اس کے یہاں دے آئے۔

ابھی وہ چار چھے قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ میں نے اُسے پھر آواز دی، آہستہ سے۔ وہ فوراً ہی پلٹا تو میں نے زور دے کر اُس سے کہا "برتن واپس ضرور لے لینا"۔

چھیتن کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ کم سے کم میرے والد کے زمانے سے ہمارے یہاں یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ ملازموں کی ایمانداری کا طرح طرح سے امتحان لینے کے بعد سب سے زیادہ ایماندار پائے جانے والے ملازم کو دوسروں سے الگ حیثیت دے دی جاتی ہے اور اُس پر گھر کے لوگوں کی طرح بھروسہ کیا جاتا ہے۔ شروع مہینے میں اُسے ہزار پان سو روپے دے دیے جاتے ہیں اور جب یہ روپے ختم ہونے کے قریب ہوتے ہیں تو وہ حساب کا پرچہ پیش کر دیتا ہے۔ یہ پرچہ اُس کے سامنے ہی کسی چیز سے دبا کر یا میز پر رکھی ہوئی کسی کتاب میں رکھ دیا جاتا ہے اور آگے کے خرچ کے لیے روپے دے دیے جاتے ہیں۔ روپے دیتے وقت یہ بھی خیال نہیں رکھا جاتا کہ کتنے روپے بچ رہے ہیں اور سمجھا یہی جاتا ہے کہ اب اُس کے پاس بس اتنے ہی روپے ہیں جتنے اس وقت دیے گئے ہیں۔

اُس کے چلے جانے کے بعد یہ پرچہ کوڑے دان میں پھینک دیا جاتا ہے اور اُس کی جانچ پڑتال کبھی نہیں کی جاتی۔ ویسے ایک آدھ بار یہ بھی ہوا ہے کہ گھر کے کسی شخص نے پرچہ اُٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا لیکن اُس کا مقصد حساب کتاب میں کسی قسم کی گڑبڑی کا پتہ لگانے کے بجائے خود کو مصروف رکھنے یا یہ ظاہر کرنے کے علاوہ کہ اُس کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود حساب کے پرچے کے بغیر یہ نہیں مانا جاتا تھا کہ پہلے والے روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ یہ سب کچھ چھیتن جانتا ہے اور والد کے زمانے کے اُس سے پہلے کے ملازم کو بھی یہ بات ضرور معلوم رہی ہوگی۔

کسی نامحرم کو ہمارے گھر کے اندر جانے کی اجازت نہیں لیکن اس طرح کے ملازم سے بس کا نا پردہ کیا جاتا ہے اور وہ ڈیوڑھی کے اندر تک جا سکتا ہے جہاں سے گھر کی خواتین پر اُس کی نظر ضرور پڑتی ہوگی۔ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ گھر کی کوئی بہو یا بیٹی پردے کی برائے نام اوٹ سے چھیتن سے کوئی ایسی چیز منگا لیتی ہے جس کا نام ماں یا

ساس کے سامنے لیتے اُسے جھجک محسوس ہوتی۔ اس طرح کی چیزوں کے لیے روپے الگ سے دیے جاتے ہیں، اور بچ رہنے والے پیسے یا روپے تک واپس نہیں مانگے جاتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ حساب کے پرچے میں اُس کا ذکر نہیں ہوتا۔

''اور کچھ تو نہیں منگوانا بیٹا'' سے مراد ایسی ہی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی بہو یا بٹیا ڈیوڑھی کے پاس سے گزرتی ہے یا وہاں آتی ہے، وہ یہ جملہ دہرانا نہیں بھولتا۔ ممکن ہے اس کا سبب وہ تھوڑے سے روپے پیسے ہوں جو کسی حساب کتاب کے بغیر اُسے مل جاتے ہیں۔ لیکن ویسے بھی چھیتن خاصا ذمہ دار قسم کا ملازم ہے اور اُسے معلوم رہتا ہے کہ گھر میں کس کو کس چیز کی ضرورت ہونی چاہیے۔

برتن ضرور واپس لے آنے کی ہدایت کے پیچھے راز یہ تھا کہ میرے خیال میں چھیتن چھوٹا سا پیالہ یا ایسی ہی کوئی چیز لینے کے لیے ڈیوڑھی سے آوازیں لگانے اور پھر اُسے واپس کرنے کے لیے اتنی ہی مشقت اُٹھانے کے بجائے اپنے یہاں سے ہی برتن لے لے گا۔ میرے لیے اس میں دو فائدے تھے۔ پہلا یہ کہ بھائی صاحب کو پتہ نہ چل سکے گا کہ اُن کے یہاں کام کرنے والے کسی آدمی یا اس کی بیوی نے اپنی چھوٹی موٹی ضرورت کے لیے مجھ سے مدد مانگی ہے۔ یوں تو بھائی صاحب کے پاس ہم لوگوں سے کہیں زیادہ دولت ہے لیکن اُن کا کہنا ہے کہ ذرا ذرا سی چیز کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں کی مدد کرنے سے اُن کی عادتیں خراب ہو جاتی ہیں۔ خیر، مجھے اِس سے کچھ لینا دینا نہیں لیکن اُن کی اِس بات نے میرے لیے ہمیشہ پریشانیاں کھڑی کی ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ ہم لوگ اُن کے کسی ملازم یا کسی ایسے شخص کی جو اُن کے دروازے سے خالی ہاتھ لوٹا ہو کسی قسم کی مدد کریں۔ وہ اُسے اپنی بے عزّتی خیال کرتے ہیں اور میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جو اُنہیں ناگوار ہو۔۔۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اس طرح گھر میں کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ کسی ملازمہ یا ملازم کی بیوی کی میں نے مدد کی ہے۔

برتن فوراً واپس لینے پر اِس قدر زور دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے خیال میں اُس عورت کے یہاں اتنا بہت سا تیل رکھنے کے لیے کوئی چیز مشکل ہی سے ہوگی

اور ہوئی بھی تو ضروری نہیں کہ اُس وقت خالی اور دُھلی دھلائی رکھی ہو۔ اس لیے وہ برتن کی واپسی میں ٹال مٹول ضرور کرے گی۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ محض اس اُمید میں بہانے بنائے کہ شاید کام کی ریل پیل میں چھیتن سب کچھ بھول جائے۔ حالانکہ اُس کی یادداشت اتنی خراب ہوتی تو وہ دن بھر کا حساب رات میں کیسے لکھتا۔ لیکن یہ بات شاید ہی اُسے معلوم ہو۔ خیر، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ اُس کی چیز اُسے واپس مل جائے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بے خیالی میں اُس کا ذکر کسی دوسرے نوکر سے کر دے۔

آٹھ دس دن بعد ایک رات غلام گردش کی طرف سے کسی عورت کے رونے کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔ میں مکان کے جس حصے میں رہتا ہوں وہ باہر کی جانب ہونے کی وجہ سے ملازموں کے کوارٹروں کے پاس ہے اس لیے یہ آوازیں مجھ تک پہنچ گئیں لیکن گھر کے اندر شاید ہی کسی نے اُنہیں سنا ہو۔ ہمارے قلعے ایسے مکان کی اُونچی اور موٹی دیواروں سے باہر کی آوازوں کا چھن کر داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا چنانچہ ہمارے یہاں کی عورتیں اونچی آواز میں باتیں کرتی ہیں اور یہ اُن کی مجبوری بھی ہے۔ مجبوری یوں کہ شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو کہ کوئی نہ کوئی رشتے دار اور اُس کے بچّے بچّیاں ہمارے گھر میں نہ ہوتے ہوں۔ ویسے تو یہ رشتے دار دو چار دنوں کے لیے ہی آتے ہیں لیکن ہوتے ہوتے اُن کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ بہت سوں کو تو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اُنہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اِس کے باوجود مجھے ظاہر یہی کرنا پڑتا ہے کہ میں اُنہیں خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ لیکن یہ پریشانی بس دو چار منٹ ہی کی ہوتی ہے کیوں کہ طرح طرح کے چمکدار کپڑوں میں ملبوس عورتوں اور اُن کے سدھائے ہوئے شوہروں اور بچّوں بچّیوں کو سمجھا دیا جاتا ہے کہ سلام کر کے بس ایک دو منٹ کھڑے رہیں اور پھر دوبارہ سلام کر کے واپس آجائیں۔

ان مہمانوں کے بچّوں کی وجہ سے جب تک وہ سو نہیں جاتے ٹی۔ وی۔ اونچی

آواز میں چلتا رہتا ہے اور اُس شور میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ملازماؤں میں ذات پات کا سن نہیں پاتیں اور خواتین کو یہ کام دو دو تین تین بار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چوں کہ آوازیں ایک دوسرے کو کاٹتی رہتی ہیں اس لیے مکان کے باہری حصہ کو ایک طرح کی جھنجھناہٹ ہر وقت گھیرے رہتی ہے اور خواتین کی آواز کا پردہ بھی قائم رہتا ہے۔

رونے کی آواز پر شروع میں تو میں نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن جب اُس نے کسی طرح تھمنے کا نام ہی نہیں لیا تو میں نے چھمیتن کو بلا کر اُس سے یہ پتہ لگانے کے لیے کہا کہ معاملہ کیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے بتایا کہ ایک عورت بیمار ہے اور یہ وہی عورت ہے جس کی بچّی تیل مانگنے آئی تھی۔ یہ سُن کر میری تشویش دگنی ہوگئی۔ غلام گردش میں رہنے والی کسی ملازمہ یا ملازم کی بیوی کے بیمار پڑ جانے میں تو میرے لیے پریشانی کی کوئی بات نہ تھی لیکن گھبراہٹ مجھے اس بات کی تھی کہ میرا اور اس کا رشتہ مضبوط ہوتا جا رہا تھا اور اگر یہ بات پھیل گئی تو بھائی صاحب تو خفا ہوں گے ہی، مجھے اندرونِ خانہ کے سوالوں کے جواب بھی دینا پڑیں گے۔

اس خطرے کا احساس کرتے ہوئے میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ میں اس کی دوا دارو کے لیے کچھ کروں گا تو لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ وہی عورت ہے جس کے یہاں میں نے کڑوا تیل بھجوایا تھا اور شاید مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ لوگ باگ ذکر چاہے نہ کریں لیکن سمجھیں گے یہی کہ یہ تو صرف وہ باتیں ہیں جو ظاہر ہوگئی ہیں، ورنہ میں اس عورت کے لیے نہ جانے کب سے کیا کیا کچھ کرتا رہا ہوں گا۔

ویسے تو میں زیادہ تر باہر کے کمرے ہی میں رہتا ہوں اور اندرونِ خانہ کے افراد اور خاص طور سے بیگم صاحبہ سے کوئی بہت زیادہ تعلق نہیں رہ گیا ہے لیکن یک طرفہ خفگیوں اور طنز کے تیروں کا سامنا کرنا پڑتا ہی رہتا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کسی عورت کی وجہ سے، چاہے وہ بھائی صاحب کے ملازم کی بیوی ہی کیوں نہ ہو، میری پریشانیوں میں اضافہ ہو جائے۔ اگرچہ یہ بات بالکل صاف تھی کہ میں نے نہ تو تیل مانگنے کے لیے اس عورت کی ہمت افزائی کی تھی اور نہ اس کے کمرے سے رونے کی جو آوازیں آ رہی

تھیں ان سے میرا کسی طرح کا کوئی تعلق تھا۔ لیکن چوں کہ میں گھر کے باہر کم نکلتا ہوں اس لیے ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں کون کس وقت کیا لگائی بجھائی کر دے اور میرے تین چار دن جہنم بن جائیں۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ اس کا کوارٹر زنان خانہ سے ذرا فاصلہ پر تھا اور تہوار کی وجہ سے غلام گردش میں رہنے والے مردوں اور عورتوں کی اپنے اپنے کاموں سے ابھی واپسی نہیں ہوئی تھی نہیں تو طرح طرح کی باتیں نہ جانے کب کی پھیل چکی ہوتیں۔

میں نے اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کی ترکیبوں پر غور کرنا شروع کیا تو پہلی بات جو ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں اس آواز پر توجہ نہ دوں لیکن اس میں خطرہ یہ تھا کہ لوگ کہیں گے کہ میں سنی ان سنی کر رہا ہوں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ رونے کی آواز جو کبھی کبھی بہت تیز ہو جاتی ہے مجھ تک نہ پہنچی ہو اور جب یہ طے ہو جائے گا کہ میں جان بوجھ کر ان آوازوں کے بارے میں ایسا بن گیا ہوں جیسے کچھ ہو ہی نہ رہا ہو تو ظاہر ہے لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک ضرور پیدا ہوں گے۔

اس طرح کا خطرہ تو مدد کرنے میں بھی ہے، میں نے سوچا، تب ایک ترکیب سمجھ میں آئی کہ اندرونِ خانہ جا کر ساری بات بیوی کو بتا دوں اور اُن سے کہوں کہ کسی ملازمہ کو بھیج کر معلوم تو کر لیں کہ اس عورت کو کیا تکلیف ہے لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو بیگم صاحبہ پہلے تو مجھے مشکوک نظروں سے دیکھیں گی اور اگر زیادہ خفا نہ ہوئیں تو بھی طنزیہ لہجہ میں کم سے کم یہ ضرور کہیں گی کہ مجھے اب اُن ملازماؤں کی صحت کا بہت زیادہ خیال رہنے لگا ہے۔ خیر یہ سب بھی ہمیشہ کی طرح برداشت کر لوں گا لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ جلی کٹی سنانے کے بعد بھی وہ اس کی کوئی مدد نہ کریں اور بعد میں گھر کی ساری عورتیں مجھے دیکھ کر کچھ اس طرح مسکراتی رہیں جیسے وہ مسکرائے بغیر مجھ پر ظاہر کر رہی ہوں کہ وہ سب کچھ جانتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ بیوی کے درمیان میں آ جانے کے بعد میرے لیے اس عورت کی مدد کرنا ناممکن ہو جائے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری ساری رات رونے کی آواز سننے اور بستر پر کروٹیں بدلنے میں

گزر جائے۔

اس سلسلے میں سارے خطروں کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنے کے بعد مجھے سب سے آسان اور محفوظ راستہ یہی نظر آیا کہ بیس پچیس روپے چھیتن کے ہاتھوں بھجوا کر اس کو ہلوادوں کہ ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے آئے۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ چھیتن سے اس عورت کو پچیس تیس روپے دے آنے کے لیے کہہ دوں لیکن پھر خیال ہوا کہ ایسا کیا تو وہ حساب کے پرچے میں اس کا نام ضرور لکھے گا اور رقم بھی درج کرے گا۔ اور اتفاق سے یہ پرچہ کسی کے ہاتھ پڑ گیا تو چاہے وہ اسے غور سے نہ بھی دیکھے لیکن ایک ہی نام دو جگہ لکھا ہوگا تو اس کی نظروں سے بچ نہ سکے گا اور اگر اس نے کسی سے اس کا ذکر نہ بھی کیا کہ اسے کس قدر قیمتی راز معلوم ہے تب بھی بات پھیل جائے گی۔

خوش قسمتی سے میں تھوڑی دیر قبل ہی اپنے ایک دوست کے یہاں سے آیا تھا۔ ویسے کسی دوست کے یہاں جانے یا واپس آنے میں تو ایسی کوئی خاص بات نہیں لیکن مجھے یہ احساس کر کے تھوڑا سا اطمینان ہوا تھا کہ اسے روپے دینے کے لیے مجھے الماری بھی کھولنا نہیں پڑے گی، کیوں کہ سردی کی وجہ سے میں اوور کوٹ اب بھی پہنے ہوا تھا اور روپے اس کی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ البتہ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ روپے کتنے ہیں کیوں کہ اپنے دوست کے یہاں جاتے وقت میں نے الماری کھول کر گِنے بغیر تھوڑے سے نوٹ جیب میں ڈال لیے تھے۔ ویسے تو اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی لیکن والد مرحوم کی یہ بات مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ خالی جیب گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔

اتفاق سے اُسی وقت چھیتن سامنے سے گزرا تو میں نے اسے آواز دے کر بلایا اور اس کے آنے کے بعد جیب سے روپے نکالے تو سارے نوٹ سَو سَو ہی کے تھے۔ چنانچہ میں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ مجھے پریشانی بس یہ ہے کہ وہ اسی طرح روتی رہی تو آرام کی نیند سو نہ سکوں گا، سو روپے کا نوٹ ہی اس کے حوالے کر دیا اور غلام گردش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا آنے کے لیے

کہہ دے۔ چھیتن کو دو باتوں پر حیرت تھی۔ ایک تو اس پر کہ میں گھر کے حساب کتاب سے باہر کسی کی مدد کر رہا ہوں اور دوسرے یہ کہ اتنے بہت سے روپوں سے۔ لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور خود کو سمجھانے لگا کہ اس خطرناک گھڑی میں نوٹ تڑوانے کی حماقت کرنا بہت سی مصیبتوں کو دعوت دینا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد غلام گردش سے رونے کی آوازیں آنا بند ہو گئیں معلوم نہیں اس کی تکلیف ختم ہو گئی تھی یا وہ ڈاکٹر کے یہاں چلی گئی تھی۔

لیکن یہ سوچے بغیر کہ رونے کی آواز بند ہو جانے کا سبب کیا ہے میں سونے کی تیاری کرنے لگا۔ اسی وقت مجھے ایک بات یاد آئی جو میں بالکل ہی بھولے ہوئے تھا۔ میں نے آدھے کلو تیل کا مہر بند ڈبا اس کے یہاں بھجوا دیا ہوتا تو ظاہر ہے تیل استعمال کر چکنے کے بعد اس نے وہ ڈبا پھینک تو نہ دیا ہوتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسے یہ کہتے ہوئے سب کو دکھاتی کہ حویلی کے چھوٹے صاحب نے اسی میں تیل بھیجا تھا۔

مجھے یہ سوچ کر بہت خوشی ہوئی کہ اب میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا اس قدر عادی ہو چکا ہوں کہ بھولے سے بھی مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد نہیں ہوتی جس میں کسی قسم کا خطرہ ہو۔

میں نے اطمینان کی سانس لی اور کروٹ بدل کر نیند کا انتظار کرنے لگا۔۔۔
میرے کمرے پر سکون طاری تھا اور غلام گردش سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔

■ ■

ایک کھردری سی رومانی کہانی

خوشگوار موسم اور چائے کی تین پیالیوں نے مجھے وہ کہانی لکھنے کے لیے بالکل تیار کر دیا تھا جو کئی دنوں سے دھمکا رہی تھی کہ اب بھی مجھے نہ لکھا تو میں کہیں اور چلی جاؤں گی۔۔۔۔لیکن وہ کہانی تھوڑی سی رومانی ہے، میں نے سوچا اور خود سے کہا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ویسے اِس وقت موسم اتنا اچھا ہے کہ بالکل دوسری طرح کی کہانی لکھنے کی کوشش کی تو وہ بھی چاہے نہ چاہے رومانی ہو ہی جائے گی۔

اتوار کا دن تھا، نہ دفتر جانا تھا نہ کسی سگے سمبندھی کے یہاں، اس لیے یہ سوچ کر کہ وقت ہی وقت ہے، میں نے فیصلہ کیا کہ اخبار کی سرخیوں پر تو نظر ڈال ہی لوں۔ کوئی ایسی ہی دلچسپ خبر ہوئی تو اُسے پڑھ بھی لوں گا ورنہ یہ کام بعد میں کروں گا، یعنی کہانی لکھنے کے بعد اور یہی میں نے کیا بھی تھا۔

ہوا نرم اور ٹھنڈی تھی اس لیے میں کہانی لکھنا شروع کرنے سے پہلے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک طرف خوبصورت اور کشادہ مکان تھے اور دوسری طرف کمہاروں کے کچے مکان اور جھونپڑیاں جن میں وہ نہ جانے کتنی پشتوں سے رہ رہے

تھے اور اسی وجہ سے محلّے کا نام کمہار پورہ پڑ گیا تھا۔ لیکن نئے مکانوں میں رہنے والوں کو یہ نام کچھ پسند نہ تھا اور وہ کئی بار باتوں باتوں میں کہہ چکے تھے کہ میونسپلٹی میں درخواست دے کر محلّے کا نام تبدیل کرالیا جائے لیکن درخواست ارخواست تو اُنھوں نے دی نہیں البتہ آس پاس کے پکّے مکانوں میں پہلے سے رہنے والوں سے ان کا میل جول بڑھا تو بس ذکر کر کے محلّے کا نام خود سے کبیر نگر رکھ دیا۔

کمہاروں کو تو اس کا پتہ بہت بعد میں چلا۔ ویسے پہلے معلوم بھی ہو جاتا تو وہ کیا کر لیتے۔ بلکہ شاید اس کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ اُن کے یہاں کونسی ڈاک بیٹھی تھی کہ اُنہیں لوگوں کو نام کی تبدیلی کی خبر دینی ہوتی اور ان دنوں تو بے چارے ایک دوسرے ہی معاملے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ وہ لمبی چوڑی زمین جس پر ان کے کچے پکے مکان تھے اور جھونپڑیاں بلڈروں کی نگاہوں پر چڑھ گئی تھی اور وہ اُسے کسی نہ کسی طرح ہتھیا لینا چاہتے تھے۔ طرح طرح کی لالچ اور بہلانے پھسلانے سے کام نہ چلا تو اُنھوں نے غنڈوں کا سہارا لیا تھا لیکن یہ داؤ بھی نہیں چل پایا کیوں کہ اُن کے اور ان کے اور ان کی بیویوں اور اولادوں کے سات ساڑھے سات سو ووٹ تھے اور الکشن قریب ہونے کی وجہ سے ہر پارٹی اُن کی حمایت میں کھڑی ہوگئی تھی۔

لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ بلڈر اس جگہ پر قبضہ کرنے کی کوشش آسانی سے چھوڑیں گے نہیں اور جب الکشن ختم ہو جائیں گے اور کسی کو اُن کے ووٹوں کی ضرورت نہیں رہ جائے گی تو معاملہ پھر گرمائے گا۔ بے چارے لالچ اور زور زبردستی کا مقابلہ کب تک کر پائیں گے اور تھک ہار کر ایک نہ ایک دن زمین خالی کر ہی دیں گے، میں نے کسی قدر افسوس کے ساتھ سوچا تھا۔

اُسی وقت مجھے خیال آیا کہ میں آیا تو یہاں اس خیال سے تھا کہ تھوڑی دیر تازہ ہوا کا لطف لینے کے بعد کہانی لکھنے بیٹھ جاؤں گا اور اُلجھا لیا اپنے آپ کو کمہاروں کی اس بستی میں۔ ویسے باتیں تو اس بارے میں برابر ہی ہوتی تھیں اور غریبوں کا زبردست ہمدرد ہونے کی وجہ سے میں کہتا بھی تھا کہ اُن کے ساتھ زیادتی نہیں ہونی چاہیے اور

یہاں سے اُکھاڑ پھینکے گئے تو غریب کہاں جائیں گے لیکن دل میں ایک چور بھی تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ اگر اس جگہ شاندار مکان بن گئے اور پڑھے لکھے شریف اور کھاتے پیتے لوگ رہنے لگے تو لوگوں کو اپنے مکان کا پتہ بتانے میں کتنی آسانی ہو جائے گی۔ قریب کا راستہ کسی کو بتاتے کچھ اچھا نہیں لگتا کیوں کہ وہ اُن کی بستی سے گذرتا ہے اور خاصا گندا ہے۔ لیکن ایک سہولت بھی ہے، میں سوچتا۔ ایک کمہار کی لڑکی میرے یہاں کام کرتی ہے اور کبھی باہر کا کوئی چھوٹا موٹا کام پڑ جاتا ہے تو ایک آواز پر کوئی نہ کوئی آ ہی جاتا ہے۔ یہ لوگ یہاں سے چلے گئے تو ڈیڑھ سو روپے مہینے پر کام کرنے والا بھلا کوئی ملے گا؟ میں نے سوچا اور دل ہی دل میں کہا ''اب ایسا بھی نہیں کہ پچاس ساٹھ سال سے رہنے والوں کو زور زبردستی سے کوئی بے گھر کردے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' لیکن یہ جملہ پورا کرتے ہی مجھے خیال آیا کہ غنڈوں نے ان کے مکانوں اور جھونپڑیوں میں آگ لگادی تو میں کیا کرلوں گا۔

اس آخری خیال نے کمہاروں اور اُن کے مکانوں کو دماغ سے بے دخل کرنے میں میری بڑی مدد کی یعنی جب کچھ کر ہی نہیں سکتا تو پریشان ہونے سے فائدہ! اور میں کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔۔۔۔ لیکن مجھے سخت حیرت ہوئی کہ دماغ میں جو جگہ خالی ہوئی تھی اس میں کہانی کے بجائے بلڈروں کے بنائے ہوئے خوبصورت مکان، ان میں رہنے والے پیسے والے لوگ، اُن کی ٹھسے دار بیویاں، جینز اور نیچی تراش کے گلوں کی قمیص پہنے ہوئے تتلیاں، بھن بھن کرتے اور اٹھلاتے بھونرے اور طرح طرح کی موٹر کاریں جانے کہاں سے داخل ہوگئیں۔ پہلے تو میں بہت اُلجھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ جو کہانی اتنے دنوں سے دماغ پر کھٹ کھٹ کر رہی تھی اسے تو کمہاروں اور بلڈروں کی کھینچا تانی نے بھگا دیا، اس لیے اب ان خوبصورت مکانوں، موٹر کاروں، ایک آدھ تتلی اور ایک دو بھونروں سے مدد لے کر کیوں نہ ایک دوسری ہی کہانی لکھ ڈالی جائے۔ لیکن اسی وقت دماغ میں ایک کیڑا کلبلایا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ تم تو بڑے غریبوں کے بڑے ہمدرد بنتے ہو، ہر وقت نظریہ نظریہ کیا کرتے ہو!''

مجھے لگا جیسے میں دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہوں۔ ایک کہتا ہے ایک بات اور دوسرا کہتا ہے اس کی بالکل الٹی بات۔ اسی اُدھیڑ بن میں کافی وقت نکل گیا لیکن آخر میں جیت ہوئی رومانی کہانی کی ہی جس نے سمجھایا کہ اس سے کیا ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے تو کون دیکھتا ہے۔ سب کی نظروں میں تم رہو گے تو غریبوں کے ہمدرد ہی۔۔۔ اور نظریہ اور اصول! اماں چھوڑو، آج تو کوئی اس کی بات بھی نہیں کرتا۔ میں مان گیا۔

اب میں نے ایک خوبصورت مکان، ایک کار اور ایک اچھی سی لڑکی اور ایک نوجوان چُن لیا اور باقی سب کو جو وہاں بھیڑ لگائے ہوئے تھے نکل جانے کا حکم دینے ہی والا تھا کہ خیال آیا کہانی میں کچھ پیچ بھی تو ڈالنا ہو گا۔ چنانچہ ایک اور لڑکی اور لڑکے علاوہ تیس بتیس برس کی ایک عورت کا بھی انتخاب کر لیا کہ شاید ماں کی ضرورت پڑ جائے اور سارے غیر ضروری لوگوں کو رخصت کر دیا۔ بس اب مجھے کسی لڑکے یا لڑکی کے دل میں محبت کا بیج بو کر یہ دیکھنا تھا کہ انکھوا پھوٹنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

اس کے بعد میں نے کہانی لکھنا شروع کر دی۔ ایک جملہ لکھا، بات کچھ بنی نہیں۔ پھر بھی میں نے اسے کاٹا نہیں، یہ سوچ کر کہ ممکن ہے دوسرا جملہ لکھوں تو یہ بھی کام کا بن جائے۔ لیکن دوسرا جملہ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ایک لڑکی، نہیں عورت، جو کبھی گوری چٹی اور نازک ناک نقشے کی مالک رہی ہو گی، جانے کہاں سے آ کر میری نظروں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ جانے کہاں سے تو یوں ہی قلم سے نکل گیا، اسی بھیڑ میں سے کوئی رہی ہو گی جو میں نے کہانی لکھنے کے لیے اکٹھا کی تھی۔ لیکن میری پریشانی ختم نہیں ہوئی۔ ایک اچھی خاصی لڑکی میری کہانی میں داخل ہوتے ہی عورت کیسے بن گئی اور وہ بھی نہایت معمولی شکل و صورت کی۔ پھر یہ خیال کر کے تھوڑا سا اطمینان ہوا کہ اس کی صورت کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔ اس کے بارے میں دو چار باتیں یاد آ ہی جائیں گی اور کہانی کا تانا بانا بننے میں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔

اب میں کہانی کے بجائے اس عورت کے بارے میں سوچنے لگا۔ کبھی معلوم

ہوتا کہ اس کی یادوں کی پرتیں بس کھلنے ہی والی ہیں اور کبھی محسوس ہوتا کہ میں تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے جانے کیسے میرے مونہہ سے ایک جملہ نکلا۔ ''اب جانے بے چاری کس حال میں ہوگی۔ معلوم نہیں زندہ بھی ہے یا مر کھپ گئی؟'' اور اس خیال کے ساتھ ہی بہت سی پرانی باتیں یاد آ گئیں۔

بات خاصی پرانی یعنی پینتیس چالیس سال پہلے کی تھی۔

وہ سورج کی آخری کرن کے نظروں سے اوجھل ہونے سے پہلے رکشے پر آتی، ہمیشہ ہی اسکرٹ میں، اور الیزبتھ سینما کے سامنے والے سائنکل اسٹینڈ کے مالک کو مسکرا کر سلام کرتی۔ دو چار منٹ اس سے باتیں کرتی اور کسی اچھے سے ہوٹل میں چلی جاتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ وہیں کوئی اس سے ٹکرا جاتا اور کبھی یہ ہوتا کہ کوئی اسے پوچھنے آتا تو سائنکل اسٹینڈ کا مالک اسے بتا دیتا کہ روزی کس ہوٹل میں ملے گی۔

''اکیلی ہے یا کسی کے ساتھ؟'' کوئی پوچھتا تو وہ کہتا، ''نہیں کوئی ساتھ تو نہیں تھا۔ اب وہاں اس نے کسی کو بلایا ہو تو معلوم نہیں لیکن ہاں کوئی ساتھ میں ہو تو بس دیکھ کے چلے آنا، سمجھ گئے نا!''

یہ کہتے ہوئے خان بھائی کا چہرہ سپاٹ رہتا۔ کسی قسم کے طنز یا شرارت کا لڑکا جھکا نہ ان کے لہجے میں ہوتا نہ ان کے چہرے پر نظر آتا۔ پرانے زمانے کے آدمی تھے، اتنی دُنیا دیکھی تھی کہ اب اچھا برا سب ایک سا ہو گیا تھا۔ ''اپنے کو کیا، اپنا برا بھلا آپ جانے''، وہ کہتے، ایک ٹھنڈی سانس بھرنے کی کوشش کرتے اور آواز میں کسی اتار چڑھاؤ کے بغیر کہتے ''لیکن وہ بے چاری کیا جانے'' وہ بدبداتے، پھر اپنی چگی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور جیسے بلا سبب اداس ہو جاتے۔ کیسی بھولی بھالی تھی ۔۔۔ کیریر میں بستہ دبائے ہوئے آتی اور سائیکل کھڑی کر کے مسکراتی ''خان بابا ابھی آئی، سامنے کی دوکان سے چاکلیٹ لے لوں۔'' اس کی مسکراہٹ کا مطلب یہ ہوتا کہ آٹھ آنے ہی تو ہیں میرے پاس، تمہیں دے دوں گی تو چاکلیٹ کہاں سے خریدوں گی۔ وہ ہنستے ہوئے

کہتے ''جا جا کایٹ خرید لے، تجھ سے پیسے کون مانگ رہا ہے''۔ پھر جانے کیا ہوا، وہ یاد کرتے پہلے بستہ غائب ہوا، پھر سائکل کی جگہ رکشے نے لے لی اور اب۔ لیکن وہ بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس کے آگے کبھی نہ سوچتے۔ کبھی کوئی سائکل جمع کرنے یا واپس لینے آ جاتا اور یہ سلسلہ ختم ہو جاتا لیکن کوئی نہ آتا تو بھی ان کے دماغ کی سائکل میں یہاں تک پہنچتے پہنچتے جانے کیوں بریک لگ جاتے۔

بہت دن پہلے جب انہوں نے اسے پہلی بار کئی ہفتوں تک ایک نوجوان کے ساتھ دیکھا تھا تو دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے تھے۔ ''اس کی نیا پار لگ جائے تو بڑا کام ہو جائے'' معلوم نہیں اُنہوں نے دُعا مانگی تھی یا بس سوچ کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ بات وہ اپنے آپ سے کئی بار کہہ چکے تھے۔ دُعا نہ ہوتی تو بار بار دہراتے کیوں!

ایک بار وہ کئی دنوں تک نہیں آئی تو خان بھائی کو کچھ پریشانی ہوئی، لیکن کیا کرتے۔ اس کا گھر بھی تو نہیں جانتے تھے کہ جا کر پتہ چلاتے۔ لیکن پتہ معلوم ہوتا تو بھی شاید ہی جا پاتے۔ پکچر کا دوسرا شو ختم کر کے، جب ایک ایک سائکل واپس چلی جاتی تب انہیں گھر جانے کو ملتا اور اگلے دن بارہ بجے سے پہلے پھر اپنی ڈیوٹی پر آ موجود ہوتے۔ ایسے میں اُن کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔۔۔ مہینے سوا مہینے بعد وہ آئی اور اس نے اُن کی آنکھوں میں سوال دیکھا تو خود سے بولی۔ ''ممی بیمار ہو گیا تھا۔ اب تھوڑا بہوت ٹھیک ہے۔''

اگلے سات آٹھ مہینوں میں کئی بار کئی دنوں تک خان بھائی خوش ہوئے جب اُنہوں نے اُسے رخصت ہوتے وقت ایک ہی نوجوان کے ساتھ سلام کرنے کے لیے آتے دیکھا اور اداس ہوئے جب وہ اکیلی آئی اور مسکرائے بغیر سلام کر کے چلی گئی۔ ''یہ بات سات آٹھ بار تو ہوئی ہوگی'' خان بھائی نے کبھی روشن اور کبھی ویران آنکھوں سے سوچا۔

پھر کئی دن غائب رہنے کے بعد وہ آئی تو اس نے خان بھائی کو بتایا ''خان بابا، ممی چلا گیا''۔

''کب؟'' خان بھائی اس کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔

''تین دن اودھر۔۔۔بہت درد تھا اس کے پیٹ میں۔اب آرام سے ہوگی''۔

''اور پاپا کیسے ہیں، ٹھیک ہیں ناوہ؟''

''پاپا۔۔۔؟ ہاں وہ تو بالکل ٹھیک ہیں۔اُن کو کوئی غم نہیں ہوتا'' اس کے چہرے پر نہ کوئی خوشی تھی نہ کوئی غم۔''وہ تو چرچ بھی نہیں گئے تھے۔اس نے کہا اور خان بھائی کے اسٹول پر بیٹھ گئی۔اُنہیں یاد آیا کہ جب وہ چھوٹی سی تھی اور ممی پاپا کے ساتھ آتی تھی اور دونوں کی اُنگلیاں پکڑے پکڑے ہر وقت اُچھلتی رہتی تھی اور وہ دونوں اُسے ہنستے ہوئے ڈانٹتے تھے تو وہ اُنہیں چھوڑ کر اُن کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی تھی اور اپنے بدن سے دھیرے دھیرے زور ڈال کر اُنہیں ڈھکیلنے کی کوشش کرتی۔ پہلے وہ اُسے چڑانے کے لیے اسٹول پر مضبوطی سے جم جاتے تھے اور پھر ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور وہ جلدی سے اس پر بیٹھ کر اُنہیں ایسے دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو''بھگا دیا نا!''

اور وہ سب ہنس دیتے تھے۔

ادھر کئی دنوں سے خان بھائی محسوس کر رہے تھے کہ روزی کچھ زیادہ ہی پریشان ہے۔اب وہ ان بڑے ہوٹلوں کے بجائے جہاں وہ پہلے جایا کرتی تھی ایک چھوٹے سے ہوٹل کا رخ کرتی ہے۔اس کو پوچھنے والے لوگوں میں کاروں اور موٹر سائکلوں پر آنے والے نوجوان بھی دھیرے دھیرے کم ہوتے جا رہے تھے۔خان بھائی یہ سب کچھ دیکھتے،کڑھتے،لیکن کیا کر سکتے تھے،خاموش رہ جاتے۔

پھر ایک دن یہ ہوا کہ وہ آئی تو روز کی طرح ہی،اس معمولی ہوٹل میں بھی گئی جہاں وہ اب جانے لگی تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ تھوڑی دیر بعد سڑک پر نکل آئی اور اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔نظریں جمائے کبھی بائیں طرف دیکھتی رہی کبھی دائیں طرف اور اداس اداس سی ہوٹل لوٹ گئی اور جب رات کے آٹھ ساڑھے آٹھ ہو گئے اور وہ خان بھائی کو گھر واپس جاتے وقت کا سلام کرنے آئی تو اُسے اکیلا دیکھ کر اُنہیں بہت دکھ ہوا۔۔۔ پہلے یہ تو نہیں ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ آنے والا ہمیشہ ہی اس کے ساتھ

واپس جائے لیکن یہ ضرور تھا کہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو جاتے یہیں سے تھے، الگ الگ رکشوں میں، ایک ادھر، دوسرا اُدھر۔ انہوں نے سوچا لیکن وہ بولے کچھ نہیں۔

طرح طرح کی باتیں تو لوگ، خاص طور سے وہ نوجوان جو ہوٹلوں میں ٹھٹھے لگاتے ہیں، اُس کے بارے میں کرتے ہی رہتے تھے لیکن اُن میں دو چار ایسے بھی تھے جن کی رائے اُس کے بارے میں اتنی خراب نہ تھی اور ان سے کہا جاتا تو وہ شاید اس کی پارسائی کی قسم بھی کھا لیتے۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ اتنی بھولی ہے کہ بار بار دھوکا کھاتی ہے اور اس کے خوابوں کا نوجوان ہر بار اسے جُل دے جاتا ہے۔ میرا بھی کچھ کچھ یہی خیال تھا، البتہ اس کی پاکبازی کی قسم شاید میں نہ کھاتا کیوں کہ مجھے اُس کے بارے میں اوروں سے کچھ زیادہ معلوم تھا۔

میں جانتا تھا کہ اُس کا بڑا بھائی پیٹر، جو کئی برس تک میرے ساتھ ایک کمپنی میں کام کر چکا تھا، ماں کی مستقل بیماری، باپ کی شراب کی لت اور دونوں کے درمیان روز کی تو تو میں میں سے تنگ آ کر جانے کب سے چھوڑ کر کہیں اور رہنے لگا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ شراب کے لیے جس دن پیسوں کا انتظام نہیں ہو پاتا تھا وہ چلاّ چلاّ کر سارا گھر سر پر اُٹھا لیتا تھا اور اس کی ممّی کو مارتا بھی تھا۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ پیٹرک نے، جو اُس کا اُس وقت کا ہیرو تھا جب اُس نے خواب دیکھنا ابھی ابھی شروع کیا تھا، اس کے بلا خیز عشق اور اپنی ''سَیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی'' والی محبت کے خراج میں اس سے کیا کیا وصول کیا تھا۔ یہ سب کچھ پیٹر نے ایک دن جب وہ غصّہ میں تھا اور نشے میں بھی، اُگل دیا تھا۔ یہ باتیں وہ نہیں جانتے تھے جو اسے معصوم سمجھتے تھے۔ پھر بھی ان کی تعداد اب ایک ایک کر کے کم ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن میں اپنی سائکل واپس لینے گیا تو اسٹینڈ پر بس چار چھے سائیکلیں اور اسکوٹر رہ گئے تھے۔ خان بھائی اس انتظار میں تھے کہ اُن کے مالک آ جائیں تو وہ بھی چھٹی کریں۔ خالی بیٹھے تھے، لیکن ذرا بے چین سے۔ رات میں اُنھیں بھانجی کی شادی

میں جانا تھا اس لیے اُنہوں نے پکچر دیکھنے والوں کی سائکلیں نہیں لی تھیں۔ مجھ سے بھی کہا تھا بھیا ہم آج جلدی جائیں گے، یہی کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے، ذرا جلدی آ جانا۔ مجھے جانے کیسے اُس کا خیال آ گیا اور میں نے اُن سے پوچھا ''خان بھائی آپ کی روزی بہت دنوں سے نہیں دکھائی دی''۔

''ہاں میاں اِدھر آئی نہیں کئی دنوں سے''۔ اُنہوں نے کہا ''اب کم آتی ہے۔ لگتا ہے ہار مان لی ہے''۔

''کس سے؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے بھلا کون ہرانا چاہے گا۔

''اور کس سے ہارے گی؟ بس اپنے آپ سے ہاری ہے، اپنی قسمت سے ہاری ہے میاں''۔

''تو شادی کیوں نہیں کر لیتی؟'' مجھے کچھ اور نہیں سوجھا تو میں نے یہی کہہ دیا۔

''وئی تو کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔ لیکن کون کرے۔ بھائی نے گھر چھوڑ دیا، ماں بھی مرگئی، اب باپ نے بھی بستر پکڑ لیا ہے۔ ویسے ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہی ہے''۔

یہ سُن کر مجھے تکلیف ہوئی اور میں نے اس کا اظہار بھی کر دیا، ''تو کیا کرے گی بے چاری''

''کرے گی کیا! ہر روز نئی شادی کرے گی۔ باپ کے لیے شراب کا جگاڑ تو کرنا ہی ہے اور پھر اُن کی دوا دارو بھی''۔ اُنہوں نے کچھ اس طرح کہا جیسے اپنے سر سے بھاری گٹھر اُتار کر رکھ دیا ہو کہ جس کا دل چاہے دیکھ لے کتنا بھاری بوجھ وہ اُٹھائے ہوئے ہیں اور اس میں اپنے دُکھ کے علاوہ کس کس کے کیسے کیسے دکھ درد بھرے ہوئے ہیں۔

روزی سے مجھے ہمدردی ضرور تھی، اس کی حالت پر افسوس بھی تھا لیکن بس اتنا کہ ایک بار سر کو جھٹکا دیا اور سب کچھ بھول گیا۔ مگر اس وقت خان بھائی نے جو کچھ بتایا اس سے میرا دل بوجھل ہو گیا۔ میرے پاس روپے ہوتے تو دو چار دن کا انتظام کر ہی دیتا ۔۔۔۔ شادی کیے بغیر۔ وہ نہ مانتی تو شادی بھی کر لیتا۔ ایک رات کی، یا کئی راتوں کی ایک ساتھ ۔۔۔۔ اس سے زیادہ کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا ۔۔۔۔ لیکن اسی وقت خیال

آیا کہ میں شاید بہت دُور نکل آیا ہوں اور یہ محض ہمدردی میں نہیں ہوا ہے۔۔۔۔اس نیک ارادے کے پیچھے جو کچھ تھا وہ میری سمجھ میں آ گیا تھا لیکن میں اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کئی دنوں تک میرا اُدھر جانا نہیں ہوا۔ شاید دس بارہ دن بعد گیا تو میرے ہاتھ سے سائکل لیتے ہوئے خان بھائی نے کہا ''اب پھر سے آنے لگی ہے، آج بھی آئی ہے''۔

''ہوٹل میں ہوگی؟'' میں نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے سو دو سو روپوں کا انتظام کر کے آیا ہوں۔ خان بھائی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''اب ہوٹل میں کہاں ملے گی۔ یہیں کہیں گھوم رہی ہوگی، کسی نہ کسی کو ڈھونڈھتی ہوئی، باپ کے لیے بوتل کی تلاش میں، نہیں تو اُن کی دوا دارو کے لیے۔ بے وقوف لڑکی''۔ خان بھائی خاموش ہو گئے کیوں کہ ایک شخص سائکل جمع کرانے آ گیا تھا۔ لیکن وہ اسٹینڈ پر نظر ڈال کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا آگے بڑھ گیا تو اُنھوں نے اپنی بات کے سرے جوڑے۔ ''جب دس دس پندرہ پندرہ دن ہوٹل کا خرچہ اُٹھانے اور چھوٹے موٹے تحفے دینے کے بعد بھی کام نہ بننے پر لوگ چھوڑ کر چلے گئے تو اب بھلا کوئی سڑک پر پڑا ہوا مل جائے گا؟ بے وقوف لڑکی'' اُنھوں نے دوبارہ کہا۔ اُن کے چہرے پر دُکھ تھا۔

دکھ مجھے بھی تھا لیکن یہ جان کر کچھ اطمینان بھی ہوا تھا کہ اس سے دوستی لوگ اس لیے چھوڑ دیتے تھے کہ اُنھیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور تھوڑی سی خوشی بھی ہوئی تھی کہ میرا اندازہ زیادہ غلط نہیں تھا اور اس کی بچپن کی بھول بس بھول ہی تھی۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ سینے پر کا سارا بوجھ ہی اُتر گیا ہو۔

میں ریسٹورنٹ میں داخل تو اُسی بوجھ کے ساتھ ہوا تھا لیکن یہ پتھر اپنا تو تھا نہیں کہ ہٹائے نہ ہٹتا۔ چائے کی پیالی، دوستوں کی جملہ بازیوں اور خود اپنے قہقہوں نے ذراسی دیر میں اُسے اس چھوٹے سے ریسٹورینٹ کے کسی کونے میں لے جا کے ایسا چھپا دیا کہ ڈھونڈھے نہ مل پائے۔ دوست یار ایک کے بعد ایک آتے رہے، گپ شپ ہوتی

رہی اور وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ لیکن جب بیرے نے ایک بلب بجھا دیا اور کھڑکیاں بند کرنے لگا تو ہماری سمجھ میں آیا اور ہم باہر نکل کر بکھر گئے۔

خان بھائی کے اسٹینڈ پر بھیڑ جمع تھی جس کے بیچ سے ادھیڑ عمر کا ایک آدمی گھگھیا رہا تھا ''میں سچ کہتا ہوں یہ عورت جھوٹ بول رہی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے ٹانگ اڑا دی تھی اور میں گرتے گرتے بچا تھا''۔

''میں نے تانگ اَرائی تھی؟'' روزی ایسی تڑاخ دار آواز میں چلاّئی کہ اس آدمی کی آواز دب گئی۔ ''بڑا بھولا بن رہا ہے، تو نے میرے سینے پر ہاتھ نہیں مارا تھا۔ بول مارا تھا کہ نہیں!''

''چلو میم صاحب سے معافی مانگو'' ۔ایک صاحب نے تجویز رکھی۔

''نہیں اس سے کہو مرغا بن کے کگڑوں کوں کرے'' کسی دوسرے نے کہا۔

''مرگا بننے سے کیا ہوگا؟ ککڑوں کوں کرنے پر بھی میں اسے پارڈن نہیں کروں گی۔اس نے میرے سینے پر ہاتھ مارا تھا۔''

''میں بتاؤں'' ایک اور صاحب بولے ''اس کی ننگا جھولی لے لی جائے اور جتنے بھی روپے نکلیں ان میں سے دس بیس چھوڑ کر باقی سب مس صاحب کو دے دیے جائیں'' اُنہوں نے رائے دی۔

''یہ کیا بات ہوئی'' ایک صاحب، جو اب تک خاموشی سے سارا جھگڑا دیکھ رہے تھے، بولے ''کسی نے دیکھا ہے اسے مس صاحب کے سینے پر ہاتھ رکھتے؟ ننگا جھولی کیسے لے گا کوئی۔کون جانے کتنے روپے ہیں اس کی جیب میں۔۔۔اور کچھ نہ نکلا تو؟''

''نہیں نہیں، ایسا کرو، اس سے پوچھو کتنے روپے ہیں۔ دو ڈھائی سو ہوں تو پچاس چھوڑ دو اور باقی سب مس صاحب کو دے دو۔۔۔''

''سینے پر ہاتھ مارنے کے ڈیڑھ سو روپے؟ روزی غصے میں چلاّئی۔

''اور کیا دس ہزار لے گی؟'' ایک صاحب کو غصہ آ گیا تو خان بھائی رسان

سے بولے۔

''دیکھیے صاحب کم تو دس ہزار بھی ہیں۔ بُرا نہ مانیے گا۔ اس لڑکی کی جگہ آپ کی کوئی سگھی سمبندھی ہوتی تب بھی کیا آپ کو دس ہزار زیادہ لگتے ؟''

سناٹا چھا گیا اور سب اس شخص کو دیکھنے لگے جس نے ننگا جھولی لینے کی مخالفت کی تھی۔ وہ بھی اپنی بات پر کچھ کچھ شرمندہ معلوم ہو رہا تھا۔

''اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دو۔ جہاں چار ڈنڈے پڑیں گے، ساری ہیکڑی بھول کر سچ اُگل دے گا''۔

''میں بال بچّوں والا آدمی ہوں'' وہ گڑگڑایا۔

لیکن ابھی وہ کچھ اور کہنے والا ہی تھا کہ روزی بول اُٹھی۔

''پولیس کو دینے سے کیا ہوگا۔ وہ روپے لے کر اسے چھوڑ دے گی۔ میرا کیا ہوگا ؟'' روزی نے کہا۔

اچھا تو سچ سچ بتا تیری جیب میں کتنے روپے ہیں؟'' آخر ایک آدمی نے ادھیڑ عمر کے اس آدمی سے کہا۔

روزی کے مُنہ سے اس طرح کا جملہ سُن کر میں تو سناٹے میں آ گیا معلوم نہیں اس نازک بات کے کس نے کیا معنی سمجھے لیکن ذرا دیر کو جیسے سب کو چپّی لگ گئی۔ اس آدمی نے موقع غنیمت جانا اور جھٹ سے کہا ''میرے پاس ڈھائی سو روپے ہیں، بس دس بیس گھر جانے کو چھوڑ دو اور باقی سب مس صاحب کو ٹانگ اڑانے کا انعام دے دو''

میں سمجھتا تھا کہ انعام کی بات پر روزی بھڑک اُٹھے گی لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔۔۔۔ میں نے یہ سوچ کر کہ معاملہ نپٹ رہا ہے اور دیر کرنے سے کہیں پھر سے بگڑ نہ جائے، جلدی سے اس سے پوچھا۔

''جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے؟''

''ننگا جھولی لے لو'' اس نے کہا ''دو چار کے سکے پڑے ہوں تو پڑے ہوں۔ روپے اتنے ہی ہیں'' اور یہ کہتے کہتے اس نے کوٹ کی چاروں جیبوں سے روپے نکالے،

پھر پینٹ کی پیچھے والی جیب سے ریزگاری نکالی جو تین چار روپے کی رہی ہوگی۔

وہ جھوٹ نہیں بولا تھا۔

خان بھائی نے، جو سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہے تھے، سارے روپے اٹھا لیے۔ دس دس کے پانچ نوٹ گن کر اسے لوٹا دیے اور ریزگاری بھی اور اس سے کہا ''اب چھوٹو، کوئی سپاہی آ گیا تو ساری رات حوالات میں کاٹنا پڑے گی۔۔۔۔اور مار پڑے گی سو الگ''۔

خان بھائی نے مجھے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ وہ اس آدمی کو پھوٹی کوڑی بھی واپس نہیں کریں گے لیکن انہوں نے پورے پچاس روپے لوٹا دیے تھے اور ریزگاری بھی۔

بھیڑ چھٹنے لگی، لیکن مجھے سائکل لینی تھی اس لیے میں رُکا رہا۔

خان بھائی نے باقی ڈیڑھ سو روپے روزی کو دے دیے اور اسے روپے جیب میں رکھتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پھر اُنہوں نے اپنا ایک ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیا اور کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن صرف دو تین ہی ٹوٹے پھوٹے لفظ اُن کے منہ سے نکل سکے۔ میں بالکل ہی پاس کھڑا تھا لیکن اُنہوں نے کیا کہا میری سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ اُنہوں نے ایک بار جیسے گلا صاف کیا اور نظریں جھکا لیں۔۔۔۔ایسا لگا جیسے اپنے آپ سے لڑ رہے ہوں۔ گلا ایک بار پھر صاف کیا اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولے ''روزی بیٹا، یہی کرنا ہے تو کوئی اور جگہ ڈھونڈھ لو، یہ لفڑا روز روز یہاں ہوا تو لوگ سمجھیں گے اِس میں میرا بھی حصہ ہوتا ہے''۔

یہ کہہ کر وہ میری سائکل لانے کے لیے مڑے تو بجلی کے کھمبے کی روشنی سیدھی اُن کی آنکھوں پر پڑی۔ میں نے دیکھا اُن کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

سائکل لے کر میں چلا تو آیا لیکن راستے بھر سوچتا رہا کہ دو سو روپوں کا انتظام کر کے اس سے ملاقات ضرور کروں گا۔۔۔۔لیکن میرے اِس قابل ہونے میں کہ اپنی اور بعد میں پورے گھر کی ضرورتیں پوری کر کے اُس وقت کے دو سو روپے بچا سکوں

اتنے برس لگ گئے ہیں کہ اب جانے وہ زندہ بھی ہوگی یا نہیں۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ زندہ ہوئی اور میں نے اُسے ڈھونڈھ نکالا تو شاید روپوں کو بیچ میں ڈالے بغیر ہی وہ اپنے پوپلے مونہہ سے ساری کہانی خود ہی سنا دے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس واقعے کی یاد دلاؤں تو وہ اداس ہو جائے یا شاید ہنس دے، اپنی چالاکی پر، اپنی بے وقوفی پر یا پھر اپنی مجبوری پر۔

یہ کہانی میں نے تین سال پہلے لکھی تھی، پرانی یادوں کے سہارے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ رومانی زیادہ ہے یا کھردری زیادہ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اس طرح کی کہانی صرف پرانی یادوں کے سہارے ہی لکھی جا سکتی ہے۔ دُنیا اب اتنی بدل چکی ہے کہ وہ سارا تام جھام کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی جو بعد کے دنوں میں بے چاری روزی کو چھوٹے بڑے ہوٹلوں میں اور ان کے باہر کرنا پڑتا تھا۔ آج کی روزی کو تو اس سب کا خیال بھی نہیں آئے گا۔ اب تو سیدھا سا کھیل ہے، نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری۔ اس سارے لفڑے میں کون پڑے؟

اور ان تین برسوں میں کمہار اُجاڑے جا چکے ہیں اور وہاں دو ملٹی اسٹوری عمارتیں بن چکی ہیں۔ اُن کی جھونپڑیاں اور مکان جس دن اُجاڑے جا رہے تھے میں اپنے دو منزلہ مکان ہی میں تھا اور بلڈوزروں کی آواز نے اُن بے چارے کمہاروں کی چیخ پکار کو ڈھانپ لیا تھا۔

یہ بتا دوں کہ اس سب کے باوجود میں خود کو غریبوں اور کچلے ہوئے لوگوں کا ہمدرد اب بھی سمجھتا ہوں اور اپنے نظریات کے بارے میں اونچی اونچی باتیں اب بھی کرتا ہوں اور کوئی ٹوکتا بھی نہیں۔

جی ہاں دُنیا اب واقعی اتنی بدل چکی ہے۔

■■

سگ گزیدہ، مردم گزیدہ

بالکل اُس کے جیسا ہو جانے کا یہ میرا پہلا دن تھا۔

تبدیل ہونے کا سلسلہ کب شروع ہوا تھا یہ تو مجھے ٹھیک یاد نہیں لیکن یہ ضرور یاد ہے کہ جب میں نے پہلی بار سوچا تھا کہ ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو اُس وقت مجھے ذرا بھی امید نہ تھی کہ ایسا ہو سکتا ہے۔

میں نے تو کبھی نہیں کہا تھا کہ میں کتا نہیں ہوں، نہ سوچا ہی تھا۔ اپنی اوقات بھی میں اچھی طرح جانتا تھا اور یہ بھی کہ ایسا نہیں ہوں جسے دیکھ کر کسی کی گھگھی بندھ جائے یا بھونکوں تو چار گھر ادھر تک آواز سنائی دے۔ چھوٹا سا تھا اس لیے غصہ اور بھی آتا تھا لیکن کوئی دھیرے سے بھی ڈانٹ دے تو چپ چپاتا بیٹھ جاتا۔ پھر بھی میرے بھونکنے سے مالک کو یہ ضرور معلوم ہو جاتا تھا کہ کوئی دروازے پر ہے، اور بجلی کی گھنٹی کا سوئچ دبانے کی اسے ہمت نہیں پڑ رہی ہے، یا پھر اسے پتہ نہیں کہ باہر کے پھاٹک پر بوگن وِلیا کی جو بیل لٹک گئی ہے، گھنٹی اسی کے نیچے چھپ گئی ہے۔ میری آواز سن کر

مالک آجاتا تھا۔ میرا کام بس اتنا ہی تو تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسے بتادوں کہ کوئی نیا آدمی آیا ہے یا کچھ بھی ایسا ہو گیا ہے یا ہونے کا ڈر ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔۔۔اور اس کام میں مجھ سے ذرا بھی کمی نہیں ہوتی تھی۔

وہ خوب لمبا چوڑا تھا، میرا مالک تھا لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہر چیز میں اپنے آپ کو مجھ سے بڑا سمجھنے لگے، غصہ کرے تو بڑا بن کر، پیار کرے تو ایسے جیسے احسان کر رہا ہو اور یہ پیار اُس کی اپنی ذرا بھی ضرورت نہ ہو۔

کھانے پینے کو تو وہ مجھے خوب دیتا، پیٹ بھر کر، بلکہ اکثر یہ بھی ہوتا کہ کٹوری میں پڑے پڑے دودھ جم جاتا یا کبھی بلّی پی جاتی۔ میں دیکھ لیتا تو بھونکتے ہوئے اس پر دوڑ لیتا، وہ دُم دبا کر بھاگتی اور میں چپڑ چپڑ سارا دودھ پی جاتا۔ وہ خوب ہنستا اور اپنی اس عادت پر خود مجھے بھی ہنسی آتی کہ ویسے چاہے پڑا پڑا سڑ جائے لیکن بلّی پر نظر پڑتے ہی میری بھوک جانے کیسے چمک اُٹھتی ہے اور میں پیالہ صاف کر ڈالتا ہوں۔ اُس وقت کی اُس کی ہنسی مجھے اچھی لگتی لیکن جب وہ دودھ بھرا پیالہ میرے سامنے بڑھانے کے بعد اس میں بسکٹ ڈالتا اور میری طرف ایسے دیکھتا جیسے مجھ پر بڑا احسان کر رہا ہو تو اس کی یہ بات مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی اور کبھی کبھی میں مارے غصے کے دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ ایسے میں دودھ کو ہاتھ لگانے کو ذرا جی نہ چاہتا اور یہ بھی ہوتا کہ دھیرے دھیرے چل کر میں پانی کی ٹنکی کے پاس جا بیٹھتا۔ یہ بھی ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد وہ دیکھنے آتا کہ پیالہ خالی ہو گیا ہو تو اور دودھ ڈال دے اور اسے پہلے کی طرح بھرا دیکھ کر خفا ہونے لگتا لیکن میں اسی طرح بیٹھا رہتا جیسے وہ کسی اور پر غصہ کر رہا ہو۔ پھر وہ خوشامد پر اُتر آتا جو مجھے بہت اچھا لگتا اور میں سارا دودھ پی جاتا۔۔۔کبھی کبھی یہ ہوتا کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کر لوٹ جاتا اور میں اس کی خوشامد کا انتظار ہی کرتا رہ جاتا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب بھوک ستانے لگتی تو دھیرے دھیرے آگے بڑھتا، اس دروازے کی طرف جس سے وہ آتا ہے، مڑ مڑ کر تاکتے ہوئے کہ دیکھ نہ رہا ہو، اور سارا دودھ پی جاتا۔ کبھی کبھی یہ ہوتا کہ اِدھر میں دودھ ختم کرتا اور اُدھر وہ دروازے کی اوٹ سے اپنا سر نکالتا، ہنستے ہوئے۔ مجھے

اس کی یہ ہنسی بہت بری لگتی اور میں اپنے آپ کو خوب خوب کوستا۔ ایسی کون سی جان نکلی جا رہی تھی، تھوڑی دیر اور صبر کر لیتے تو وہ چلا جاتا اور اس کا شرارت سے ہنستا چہرہ نہ دیکھنا پڑتا۔

اس کا تھا ہی کون؟ لے دے کے بس ایک میں ہی تو تھا۔ میرا لاڈ پیار وہ خوب کرتا اور وہ بھی صرف اپنی خوشی کے لیے لیکن ظاہر یہ کرتا جیسے مجھ پر احسان کر رہا ہو۔ اس کی یہ بات مجھے ذرا پسند نہ تھی، بلکہ بہت بری لگتی۔۔۔ اس کے پیار کے بغیر مر نہ جاؤں گا، میں سوچتا۔۔۔ آخر کتے سڑکوں پر بھی تو پل جاتے ہیں، اُن پر کون احسان کرتا ہے؟ انھیں کون کھانا پینا دیتا ہے؟ پیار تو کوئی کرتا ہی نہیں، جس کا بس چلتا ہے، ایک لات جما دیتا ہے۔ وہ مر تو نہیں جاتے۔ ٹھاٹ سے سڑک پر اینڈتے پھرتے ہیں۔ لڑتے جھگڑتے بھی رہتے ہیں، کوئی اور نہ ہو تو ایک دوسرے پر ہی بھونکتے ہیں، کبھی کبھی تو لپٹے ہی لپٹے۔

لیکن ایسا نہیں کہ وہ مجھے بالکل ہی اچھا نہ لگتا ہو۔ بہت اچھا بھی لگتا تھا۔ بس اُس کی ایک بات پسند نہ تھی، بری لگتی تھی، اور یہ بھی ہوتا کہ کئی دوسری چھوٹی چھوٹی باتیں اُس میں جُڑ جاتیں اور وہ بھی بری لگنے لگتیں۔۔۔ آخر اُسے بھی تو میری ضرورت ہے، میں سوچتا۔ میں نہ ہوں تو وہ کس سے محبت کرے گا اور پیار بھری ٹھنڈی نظروں سے اسے کون دیکھے گا؟ مانا کہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے، میرا بڑا خیال رکھتا ہے لیکن میں بھی تو، گرمی ہو یا جاڑا، اس کے گھر آنے کے وقت سے بہت پہلے سے پھولوں کی کیاری کی لوہے والی جالی کے پاس کھڑے کھڑے یا جب بہت تھک جاتا ہوں تو بیٹھ کر یا لیٹے لیٹے اس کا انتظار کیا کرتا ہوں۔ کبھی کبھی تو دو دو تین تین گھنٹے سڑک کی طرف منہ کیے اس کی راہ تکنا پڑتی اور جیسے ہی وہ تالے میں چابی لگاتا میں پھاٹک کے اس پار پچھلے دو پیروں پر زور زور سے کودنا شروع کر دیتا اور جیسے ہی وہ داخل ہوتا میں اس کے کالے چمکدار جوتوں پر لوٹ لگانے لگتا۔ اُس کو میری ضرورت تھی اور مجھے اس کی۔ محبت میں یہی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی جانے کہاں سے اُس کی ڈانٹ پھٹکار اور دودھ دینے کا وہ

انداز جس میں دودھ کم اور احسان زیادہ ہوتا، یاد آ جاتا اور جی اُلٹا پلٹا ہونے لگتا۔

یہ بھی ہوتا کہ مجھے اپنا اس طرح سوچنا اچھا نہ لگتا اور اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتا۔ تھوڑی دیر کو دل مان بھی جاتا لیکن پھر کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو جاتی کہ سارا سمجھانا بجھانا بے کار ہو جاتا اور دل غصّے سے بھر جاتا۔ نفرت اور محبت کی یہ دھوپ چھاؤں بہت دن سے چل رہی تھی لیکن نفرت دھیرے دھیرے بڑھتی گئی اور آخر میں وہی ہوا جو ہونا تھا۔ اس کی وہ باتیں بھی جو پہلے اچھی لگتی تھیں بُری لگنے لگیں۔ خوب اچھی طرح استری کیے ہوئے کپڑے، چمچاتے جوتے، خوشبو جو اُس کے بدن اور کپڑوں سے آتی تھی اب ذرا نہ اچھی لگتی اور میں سوچتا کہ اتنے دنوں تک یہ سب کیسے اچھا لگتا رہا۔

اس کے بارے میں کوئی اچھا خیال اب میرے دل میں نہ آتا۔ اُسے بھی شاید کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس سے ناراض ہوں، اس لیے طرح طرح سے مجھے خوش کرنے کی کوشش کرتا۔ میرے سونے کا گدّا ابھی اچھا خاصا تھا لیکن وہ نیا لے آیا، خوب ملائم اور بڑا سا، گردن کا کالا چمکدار پٹا بھی خرید لایا، میں نے ایک بار بھی تو اُس کی طرف پیار بھری نظروں سے نہ دیکھا۔ شام کو اُس نے مجھے منانے کی ایک اور کوشش کی۔ خوب بہت سے اُبلے ہوئے قیمے میں روٹی کے بس تین چار ٹکڑے ڈال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ جی تو نہ چاہتا تھا کہ اُسے مُنہ بھی لگاؤں لیکن قیمے کی سوندھی سوندھی خوشبو سے سارا غصّہ ہوا ہو گیا۔ البتّہ دودھ کو میں نے مُنہ نہیں لگایا۔ ہاں رات میں اِدھر اُدھر جاتے ہوئے، ایک آدھ بار مُنہ مار دیا ہو تو بات دوسری ہے۔ صبح اُس میں چیونٹیاں تیر رہی تھیں۔

اُس نے دودھ کی یہ حالت دیکھی تو مارے غصّے کے اُس کا چہرہ لال ہو گیا، مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑایا اور ''ہر روز پھینکنا پڑتا ہے، کل سے آدھا کٹورا دودھ دیا کروں گا'' کہتے ہوئے اُس نے سارا دودھ آنگن کے کونے کی چھوٹی سی کیاری میں ڈال دیا۔

''ہر دن یہ کہاں ہوتا ہے؟'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''پہلے تو یہ کبھی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو سوچتا تھا کہ تھوڑا دودھ اور ہوتا تو وہ بھی پی ڈالتا اور یہی سوچتے

سوچتے پیالا صاف ہو جاتا۔''

دل میں ایک گرہ اور پڑ گئی۔

کئی دن بعد پھر وہی ہوا۔ دودھ میں چیونٹیاں رینگ گئیں اس کی نظر پڑی تو ایک دم پھوٹ پڑا۔

''مجھے تو تیری قسمت پر رشک آتا ہے۔ کسی بات کی فکر، نہ کوئی غم۔ کیسی آرام کی زندگی ہے، تیری جگہ میں ہوتا تو مالک کی جوتیاں دھودھو کے پیتا۔''

''پھر وہی بڑبولا پن۔'' میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا اور اس دن گہری نفرت کے ساتھ پہلی بار یہ خیال آیا کہ چولا بدل کر اس کے ایسا ہو جاؤں اور وہ میرے ایسا تو خوب مزا آئے، چُن چُن کر ایک ایک چیز کا بدلا لوں، اتنے احسان کروں اور خوب خوب جتاؤں بھی کہ ساری ہیکڑی بھول جائے۔۔۔ اُسی وقت میں نے سوچا کہ وہ بھی تو چاہتا ہے کہ مجھ ایسا ہو جائے۔ سچ مچ یہ ہو جائے تو کتنا مزا آئے۔ بہت دنوں بعد مجھے اُس کی کوئی بات اچھی لگی تھی۔ لیکن اس میں کتنی نفرت چھپی تھی، یہ بات اس وقت میرے خیال میں بھی نہیں آئی تھی، اور آتی بھی کیسے اُس وقت تو دل خوشی میں ڈول رہا تھا۔

شام ہوگئی لیکن میں جالی کے پاس جا کر کھڑا نہ ہوا۔ وہ آیا تو اس کے جوتوں کی آواز سننے کے بعد بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ پھاٹک کھول کر وہ اندر آ گیا تو بھی اسی طرح لیٹا رہا۔ بے خیالی میں دُم ذرا سی ہلنے لگی تھی۔ میں نے زوردار ڈانٹ پلائی تو زمین سے ایسی چپک گئی جیسے اُس میں جان ہی نہ ہو۔ اس کی آنکھوں میں حیرانی تھی، مجھے اچھا لگا۔ پھر اُن میں غصہ بھر گیا اور کچھ کہے بغیر دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا چھوڑ کر وہ گھر میں چلا گیا۔ میں نہ اُس کے پیروں پر لوٹا، نہ اِدھر اُدھر اُچھلا کودا۔

اب ہم دونوں کے بیچ دوستی کا رشتہ ذرا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ کھانا اور دودھ تو صبح شام ضرور ملتا لیکن کبھی کبھی قیمے سے سڑی سی بو آتی اور دودھ بھی کم ہوتا۔ مہینوں سے اس نے میرے سر اور پیٹھ پر ہاتھ نہیں پھیرا تھا اور مجھے اس کا ذرا بھی افسوس نہ تھا، شاید تھوڑی سی خوشی ہی تھی۔ میں سوچتا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے چھونے کی کوشش کرے تو میں

اسے کاٹ لوں۔ سچ پوچھیے تو اُسے کاٹ کھانے کو تو میرا جی بہت دنوں سے چاہ رہا تھا لیکن لوہے کی اُس چھڑ سے ڈر لگتا تھا جس سے وہ پہلے، بہت پہلے، کبھی کھیل میں اور کبھی سچ مچ مجھے دھمکاتا تھا۔

اب میں، اور شاید وہ بھی، ایک دوسرے کی نفرت کی آگ میں پھُنک رہے تھے لیکن اچھی طرح پتا مجھے صرف اپنے سینے کی آگ کا تھا، اُس کے بارے میں ٹھیک ٹھیک کچھ بھی نہ جانتا تھا، علاوہ اس کے جو اِدھر کئی دنوں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ فرج سے بوتل نکالتا، گلاس میں پانی انڈیلتا اور پھر دونوں کو تھوڑی دیر تک گھور کر دیکھتے رہنے کے بعد ایک ایک کر کے انھیں فرش پر دے مارتا اور وہ چکنا چور ہو جاتے۔ ایک دن اُس نے تخت پر سے گدّا اُٹھایا اور باہر لے جا کر اس میں آگ لگا دی۔۔ اور اس دن تو بڑا مزا آیا جب دفتر جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آیا، شاید بھاگتا ہوا کہ اس کا سارا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا، جلدی جلدی بہت سے بکھرے ہوئے کاغذ، ویسے ہی جو وہ کبھی کبھی دفتر لے جاتا تھا، میز پر رکھے، کمرے میں تالا لگایا، پھر کھول دیا اور باہر کے دروازے کے دونوں پٹ بند کیے بغیر ایک میں تالا ڈال کر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پھر لوٹ آیا۔ اُس دن وہ کرتا دھوتی پہنے تھا۔ الماری سے ٹائی نکال کر باندھی اور کاغذوں کا بنڈل اُٹھا کر چلا گیا۔ اِس بار اُس نے کنڈے میں تالا بھی نہیں ڈالا۔

اور اب کچھ ایسی باتیں بھی ہونے لگی تھیں جن کے بارے میں پہلے کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے بھی نہ سوچا ہوگا۔

ایک دن فرِج سے بوتل نکال کر اُس نے میرے پیالے میں اُنڈیل دی، بوتل میز پر رکھی، تھوڑی دیر تک پانی کے برتن کو دیکھتا رہا، پھر گھٹنوں کے بل جھک کر پیالے سے پانی پینے لگا، ہلکی ہلکی چپڑ چپڑ کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اس آواز سے تو میں بھی دھوکے میں پڑ گیا۔ لیکن میرا خیال غلط تھا، یہ میں نہیں تھا، میں تو دور کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ میری چھوٹی سی زبان لٹک ضرور رہی تھی لیکن آگے سے سوکھی تھی

۔۔۔اسی وقت مجھے جیسے ایک دم زوروں کی پیاس لگ گئی اور اس کے جاتے ہی میں پیالے کی طرف بڑھا بھی لیکن پانی گندا ہو گیا تھا، اس میں مالک کی بو آ رہی تھی۔ میں نے آگے کی بائیں ٹانگ مار کر کٹورا اُلٹ دیا، ٹنکی کے پاس کی نالی سے پانی پیا اور وہیں پیر پسار کر لیٹ گیا۔

پھر ایک دن میں نے اسے ایسی آواز میں جو کچھ کچھ اس کی تھی اور کچھ کچھ میری، کسی کو ڈانٹتے ہوئے سنا۔ اس وقت میں جانے کیسے اپنے پچھلے پیروں پر کھڑا تھا، آگے کی طرف بس ذرا سا جھکا ہوا۔ اس طرح کی باتیں برابر ہو رہی تھیں، ایک دن مجھے لگا جیسے اُس کا قد چھوٹا ہوتا جا رہا ہو۔ اسی طرح کئی دن بعد ایک شام بلّی میرا دودھ پینے آئی اور میں جھپٹا تو میرے ہاتھوں نے اُس کی دُم پکڑ لی، دانت نکال کر وہ پلٹی تو میں نے دُم چھوڑ دی۔

ہر دوسرے تیسرے دن مجھے لگتا کہ کوئی نہ کوئی نئی بات ہو رہی ہے۔ ایک دن اس کا چشمہ میرے ہاتھ لگ گیا اور میں نے اُسے لگا کر آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو شروع میں ایسا لگا جیسے میں اُس کو دیکھ رہا ہوں۔ کچھ کچھ میں تھا اور تھوڑا سا زیادہ وہ ۔۔۔ تین چار دن بعد جانے اُسے کیا سوجھی کہ کرسی سے اُٹھ کر میری گود میں بیٹھ گیا، جیسے کبھی کبھی مجھے بٹھا لیتا تھا۔ اُس دن میں نے پہلی بار اُسے چاروں ہاتھ پیروں سے چلتے ہوئے دیکھا۔

•

گھر میں کئی دنوں سے بہت کچھ اُلٹا سیدھا ہو رہا تھا۔ کئی باتیں تو میں پہلے ہی سمجھنے لگا تھا، اب گوشت، پانی، پیالے، اخبار، ٹی۔وی اور بہت سی دوسری چیزوں کو ان آوازوں سے بھی پہچاننے لگا جن سے انہیں جانا جاتا تھا لیکن میں بھونکنے کے علاوہ کچھ نہ جانتا تھا۔ ایک دن اس نے فِرج کی بوتل کا ٹھنڈا پانی گلاس میں ڈالا تو دودھ کا پیالا خالی دیکھ کر میرے مُنہ سے جو آواز نکلی وہ کچھ ویسی ہی تھی جیسی اُس کے مُنہ سے نکلتی تھی۔ کبھی فِرج وہ کھولتا کبھی میں، کبھی یہ ہوتا کہ چائے بنا کر سلائس اور مکھن میز

پروہ رکھتا اور مکھن لگانے کا کام میں کرتا۔ کوئی گھنٹی بجاتا تو دروازے کی طرف ہم دونوں بڑھتے، وہ دھیرے دھیرے بھونکتے ہوئے اور میں خاموش، کئی دنوں سے وہ باہر بھی نہیں گیا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان فرق تو اب بھی تھا لیکن اب وہ، وہ کم تھا اور میں زیادہ اور میں، میں کم تھا اور وہ زیادہ۔

اور آج صبح میں سو کر اُٹھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میری ٹانگیں خوب دور تک پھیلی ہوئی تھیں، اور ہاتھ بھی، لیکن میرا بستر تو چھوٹا سا تھا، اس پر میرے پیر اتنی دور تک پھیل کیسے گئے؟ میں نے سوچا اور ہاتھ پھیرا تو وہ چکنی چادر پر دور تک پھسلتا چلا گیا۔ میں نے آنکھیں اِدھر اُدھر گھمائیں تو یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ میں اسی بستر پر لیٹا ہوا تھا جس کے سرہانے کی طرف میں کبھی کبھی آگے کی ٹانگیں رکھ دیتا تھا تو وہ بہت دیر تک مجھ سے کھیلا کرتا تھا۔ کبھی یہ ہوتا کہ میرا جی تو چاہتا کہ لاڈ پیار کرے۔ لیکن وہ کروٹ بدل کر اپنا مُنہ دوسری طرف کر لیتا، میرا موڈ ایک دم خراب ہو جاتا۔ پھر میں اس کی پیٹھ پر دھیرے دھیرے اپنے پنجے مارتا رہتا۔ وہ دوسری طرف کچھ اور کھسک جاتا۔ میں اپنی ٹانگیں ذرا اور پھیلانے کی کوشش کرتا۔

"نو پرنس" وہ کہتا "ذرا ایک جھپکی مار لینے دو۔۔۔ بہت ضروری کام سے جانا ہے"۔

لیکن میں بھلا کہاں ماننے والا تھا۔ اپنی شرارتیں جاری رکھتا۔ دوسری طرف ذرا اور کھسک جانے کی وجہ سے اب میرا داہنا ہاتھ کئی بار کی کوشش کے بعد اُس کی پیٹھ تک ایک آدھ بار ہی پہنچ پاتا۔ تب وہ کروٹ پھر بدل لیتا۔ ایک آدھ بار مجھے ڈانٹتا، پھر وہی بات پیار سے کہتا اور جب یہ دیکھتا کہ میں کسی طرح مان کے نہیں دے رہا ہوں تو مجھے زور سے دھکّا دے کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔

لیکن یہ بات تو بہت پہلے کی ہے۔

میں نے باہر دالان میں جا کر دیکھا تو وہ چھوٹے سے گدّے پر بالکل اسی

طرح لیٹا ہوا تھا جیسے میں کل تک لیٹا کرتا تھا۔ میں نے اُسے پہچانا ایسے کہ گھر میں ہم دونوں کے علاوہ وہ تھا ہی کون؟ وہاں اور کون ہو سکتا تھا، اُس کے علاوہ۔

وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

سچ کہوں، اُسے اس حال میں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی، پھر بھی میں نے کچھ کہا نہیں، نہ محبت ظاہر کی نہ غصہ۔ اصل میں اس نئی جون میں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے اور مجھے نہ ٹھیک سے پیار کرنا آتا تھا، نہ غصہ کرنا، اس طرح کا جیسا دو پیروں پر چلنے والے کرتے ہیں۔۔۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجھے اندازہ ہوا اور حیرت بھی کہ بہت سی باتیں اور کام جو وہ کرتا تھا جیسے مجھے آپ ہی آپ آ گئے ہوں۔ اب میں چیزوں کو نئی طرح سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک روشنی ہے جو اس سے بالکل الگ ہے جو میں پہلے جانتا تھا۔ چیزوں کو سمجھنا اور کاموں کو کرنا مجھے بڑی تیزی سے آ رہا تھا۔ شاید اتنے برسوں اس کے ساتھ رہتے رہتے میں نے یہ سب سیکھ لیا تھا لیکن میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ سب کر سکتا ہوں جو وہ کرتا تھا۔

میں نے جلدی جلدی مُنہ پر پانی کے دو چھینٹے مارے، چائے کا پانی چڑھایا اور اس کا پیالا کھنگال کر دودھ سے بھر دیا۔۔۔ پھر جیسے ہی اس نے مُنہ بڑھایا میں نے پیالا اپنی طرف کھینچ لیا۔

اس نے مایوسی سے میری طرف دیکھا۔

مجھے اس کی آنکھوں میں مایوسی دیکھ کر بڑا اچھا لگا۔ کبھی کبھی اپنا یہ کھیل وہ میرے ساتھ بھی کرتا تھا۔ پھر خوب ہنستا۔ میں بھی خوب ہنسا لیکن پھر مجھے اس پر رحم آ گیا۔ معلوم نہیں رحم آ گیا یا اپنی وہ تکلیف یاد آ گئی جو اُس وقت ہوتی تھی جب یہ سب کچھ وہ میرے ساتھ کرتا تھا۔

میں نے چائے بنائی، فرج میں سے سلائس نکال کر مکھن تلاش کیا تو پتہ چلا کہ ڈبہ کوڑے دان میں پڑا ہوا ہے۔ ''چلو کوئی بات نہیں،'' میں نے خود سے کہا، ''سادے سلائس ہی کھالوں گا۔''

اصل میں کتے سے آدمی بن جانے کی مجھے اتنی خوشی تھی کہ ملھن کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔

چائے کا پہلا ہی گھونٹ لیا تھا کہ باہر کوئی چیز بھد سے گری اور میں پھاٹک کے پاس سے اخبار لے آیا۔

پہلے ہی صفحے پر دو ریل گاڑیاں اُلٹی پڑی تھیں۔ آگے کے دونوں گاڑیوں کے تین چار ڈبے اور انجن تو ایک دوسرے میں گھ گئے تھے اور ایک دوسرے کی بغل میں ہاتھ ڈالے پٹری سے دور لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں گاڑیوں کے بس پانچ چھے ڈبے پٹریوں پر کھڑے تھے اور باقی میں سے کچھ اِدھر پڑے ہوئے تھے اور کچھ اُدھر۔ بہت بڑی ٹکر ہوگئی تھی۔

اخبار میں لکھا تھا کہ بیاسی لاشیں ڈبوں کی کھڑکیاں اور دروازے توڑ کر نکالی جا چکی ہیں۔ میرا دل بڑا ہوگیا اور میں نے چائے کا دوسرا گھونٹ لیا تو لگا جیسے شکر ڈالنا بھول گیا ہوں۔

میں سوچنے لگا کہ مَرا کون ہے۔ وہ جو مارے گئے یا وہ جو یہ خبر پڑھنے کے لیے زندہ ہیں۔

میرا دل اُلٹا پلٹا ہونے لگا۔ میں نے جلدی جلدی چائے کے دو گھونٹ لیے۔ سلائس کھانے کو بھی جی نہ چاہ رہا تھا۔ میں نے اخبار تخت پر پھینک دیا، پلٹ کے دیکھا تو کٹی پٹی لاشوں کی تصویر سامنے تھی۔ میں نے اخبار پلٹ دیا۔

نیا پرنس اپنے گدے پر آرام سے لیٹا مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں نے خود کو بستر پر ڈال دیا اور نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں جاگا تو دو آنسو میرے گالوں پر بہہ کر سوکھ چکے تھے لیکن پلکوں میں ہلکی سی نمی باقی تھی۔۔۔ پہلے بھی کئی باتیں ایسی ہوتی تھیں، جو مجھے اچھی نہیں لگی تھیں، جیسے کتوں کا

آپس میں لڑنا۔ جب سب ہی کہتے ہیں تو ایک دوسرے سے لڑتے کیوں ہیں۔ یہ میری سمجھ میں کبھی نہ آتا۔ اور بھی کئی باتیں تھیں جو مجھے اچھی نہ لگتیں، لیکن موت کیا ہوتی ہے یہ میں بالکل نہ جانتا تھا، پرنس سے آدمی بن جانے کی خوشی تو بہت تھی لیکن پہلے ہی دن یہ خیال کہ ایسا بھی وقت آسکتا ہے جب میں نہ رہوں اور دوسروں کو معلوم ہو کہ میں اب نہیں ہوں بہت دکھی کر گیا۔ سینے میں ایک درد سا اُٹھا اور سارے بدن میں پھیل گیا۔ اس طرح کے درد کا احساس پہلی بار ہوا۔

گھڑی پر نظر پڑی تو ۹ بج چکے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دس بجے دفتر پہنچنا تھا۔ وقت بہت کم تھا اس لیے میں ٹھنڈے پانی ہی سے شیو کرنے لگا۔ جلدی میں ہونٹ کا ایک کونا کٹ گیا اور وہاں سے خون بہنے لگا۔۔۔ میں جلدی جلدی نہایا، نہایا کیا بس بدن پر پانی ڈال لیا، کپڑے بدلے، جوتے پہنے، بہت گندے ہو رہے تھے لیکن آفس جانے کی جلدی میں اُن پر پالش بھی نہ کر سکا۔

جلدی کیا ہوتی ہے، یہ بھی مجھے پہلے معلوم نہ تھا۔ آرام سے لیٹا رہتا، ایک کروٹ لیٹے لیٹے تھک جاتا تو کیاریوں کے بیچ سے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے جالی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا، وہ کتا نظر آجاتا جس نے میرے کھیل کو لڑائی سمجھ کر مجھے کاٹنے کی کوشش کی تھی تو جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتا میں بھونکتا رہتا۔ کبھی یہ ہوتا کہ کچھ کرنے کو نہ ہوتا تو یوں ہی دو چار بار مُنہ اونچا کر کے بھونکنے لگتا لیکن جلدی کیا ہوتی ہے اور اس میں کیا کرنا ہوتا ہے، اس کا مجھے ذرا بھی اندازہ نہ تھا۔ اسے تیز تیز چلتے دیکھتا تو کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ وہ اپنا قلم، چشمہ یا کوئی اور چیز کسی جگہ رکھ دیتا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اسے جگہ جگہ ڈھونڈھتا تو مجھے عجیب سا لگتا۔ کبھی کبھی جی چاہتا اُسے بتا دوں کہ چشمہ ٹی۔ وی پر رکھا ہوا ہے یا کوئی اور چیز کہیں اور لیکن میں بات تو کر نہیں سکتا تھا، صرف بھونک سکتا تھا اور میرے بھونکنے سے اسے کیا خاک پتہ چلتا کہ میں اسے کیا بتانا چاہتا ہوں۔ افسوس ہوتا کہ میں جانتے ہوئے بھی اس کی مدد نہیں کر پا رہا ہوں۔ اور بعد میں اُن دنوں جب اُس کے ایسا بن جانے کی لَو دل کو لگ گئی تھی اُسے اُلجھتے ہوئے

دیکھتا تو ہنستا بلکہ شاید صرف خوش ہوتا اور سوچتا کہ بولنا آتا تو بھی اُسے پھر نہ بتاتا۔

میں جیسے ہی باہر کی طرف بڑھا وہ اپنی چھوٹی چھوٹی دُم ہلاتا ہوا میرے پیچھے پیچھے چلا۔ لوہے کا گیٹ بند کر کے تالا ڈالنے جا ہی رہا تھا کہ نظر دودھ اور پانی کے خالی پیالوں پر پڑی۔ ''شام تک تو بھوک پیاس سے نڈھال ہو جائے گا، گرمی کے دن ہیں'' میں نے سوچا۔ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو دس بجنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ طبیعت بڑی طرح اُلجھ رہی تھی پھر بھی میں نے ایک کو دو بسکٹ اور دودھ اور دوسرے کو پانی سے بھر دیا۔

دفتر پہنچنے میں دیر ہو جانے کی پریشانی سے دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے جلدی جلدی تالا ڈالنے کی کوشش کی تو غلط چابی گھماتا رہا اور جب تک بات سمجھ میں آئے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ ٹیمپو پکڑنے کے لیے سڑک تک تو پہنچ ہی چکا ہوتا۔ اب اس کے سوا کر ہی کیا سکتا تھا کہ تقریباً دوڑتے ہوئے جلد سے جلد سڑک تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔

ایک ٹیمپو نکل گیا، کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، میں تیز دھوپ میں کھڑا ہاتھ ہلاتا رہ گیا، اتنے میں دوسرا آ گیا، ایک طرف دو مرد اور دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ ظاہر ہے اس طرف گنجائش نہ تھی۔ دوسری طرف سواریاں تو تین ہی تھیں لیکن ایک عورت بہت موٹی تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ذرا سی جگہ دکھائی دے تو کسی طرح خود کو اُس میں ٹھونس لوں۔

''سوچتے ہی رہو گے یا بیٹھو گے بھی بادشاہو'' ڈرائیور نے کہا اور دھیرے دھیرے ٹیمپو آگے بڑھانے لگا، میں جھٹ پٹ اندر گھس کر اپنے بیٹھنے کے لیے ذرا سی جگہ بنانے لگا۔

''جگہ کہاں ہے؟'' موٹی عورت نے کہا اور غصے سے میری طرف دیکھنے لگی۔

''بٹھا لو بادشاہو، بٹھا لو' آگے جگہ ہو جائے گی، پھر چاہے لیٹ رہنا''۔

اُس عورت کو کچھ رحم آیا میری حالت پر۔۔۔ اس نے اپنے تھل تھل بدن کو تھوڑا سا سکیڑ لیا اور میرے بیٹھنے کے لیے اتنی جگہ بنا دی کہ بدن ذرا سا ٹک گیا۔

دوسری گاڑیوں سے آگے نکل جانے کے لیے ٹیمپو دائیں بائیں لہراتا اور کچی لیکن ٹوٹی پھوٹی سڑک پر اُسے جھٹکے لگتے تو میں پیروں پر سارا بوجھ ڈال کر خود کو کسی طرح سیٹ پر ٹکائے رکھتا۔ بہت دیر تک اپنے آپ کو اسی طرح سنبھالے رہنے کی وجہ سے میرے پیر کانپنے لگے تھے۔ اتنے میں ایک سواری نے ہاتھ دکھایا تو سردار جی نے سامنے سے آتے ہوئے ایک ٹرک کو دیکھ کر ''سالے گاڑی ایسے چلاتے ہیں۔ جیسے سڑک ان کے باپ کی ہو'' کہتے ہوئے ٹیمپو روک دیا۔ ایک کے بجائے دو دبلے پتلے آدمی اندر گھس آئے۔

''بٹھالو بادشاہو'' سردار جی نے کہا اور ٹیمپو اسٹارٹ کر دیا۔

ایک ٹرک سڑک کے بیچوں بیچ سے نکلا تو دو ایک کی چیخ نکل گئی اور وہ دونوں جو دروازے اور کھڑکی کی راڈ پکڑے ہوئے تھے جھونکے سے تقریباً دہرے ہو گئے۔

''اس سے اچھا تو ہے نیچے بیٹھ جاؤ'' کسی نے کہا۔

وہ بیٹھنے لگے اور اُن میں سے ایک کا گھٹنا میرے پیر سے ٹکرایا۔ میں اپنی سیٹ سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ بائیں طرف بیٹھے ہوئے آدمی نے پکڑ نہ لیا ہوتا تو میں لڑھک ضرور جاتا۔

''کتنی سواریاں بھرتے جاؤ گے؟'' میں نے غصّے سے کہا۔

''انھیں بھی دفتر جانا ہے بادشاہو'' وہ میری طرف گردن موڑ کر مسکرایا۔

''ہم آدمی ہیں کہ کتّے بلّی!۔۔۔۔۔ چار چار تو پھر بھی چل جاتی ہیں لیکن پانچ پانچ!'' میرے غصّے کا پارا اور بھی اونچا ہو گیا۔

اس نے ٹیمپو کنارے کر کے روک دیا اور میری طرف گردن گھما کر بہت نرم لہجے میں بولا۔

''بادشاہو، معلوم نہیں ٹیمپو میں آدمی کیسے اندر آ گیا، یہ سواری تو کتّے بلّیوں کی ہے۔ اتر جاؤ بادشاہو۔ پیچھے والی گاڑی سے آ جانا''۔

غصّہ تو مجھے بہت آیا، لیکن کیا کرتا۔ دفتر بھی تو پہنچنا تھا۔ دوسری طرف منہ

کر کے سڑک کی گاڑیوں کو گننے لگا، جیسے اس نے یہ بات کسی اور سے ہی ہو۔

سردار جی زور سے ہنسے اور ''سب کو بس اپنی فکر رہتی ہے'' کہتے ہوئے انھوں نے ٹیمپو اسٹارٹ کر دیا۔ میں نے گھٹنے سے ہاتھ اٹھا کر آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھا اور ایسے بیٹھا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ باقی سواریاں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپکے چپکے مسکرا رہی تھیں۔

چوراہے پر ہمارے ٹیمپو کے آگے بہت سی موٹریں اور دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دوسری طرف سے چھوٹی بڑی کاریں، سائکلیں اور اسکوٹر آ رہے تھے۔ ''ابھی تو یہی لائن بڑی لمبی ہے، اس کے بعد بائیں طرف کا راستہ کھلے گا، پھر داہنی طرف کا، پھر کہیں جا کر۔۔۔'' کسی نے کہا۔

بائیں طرف کی گاڑیوں کی باری بھی نہیں آئی تھی کہ ایک سپاہی نے ٹیمپو کے اندر منہ ڈال کر اونچی آواز میں سواریاں گننا شروع کیں ''۔۔۔ سات، آٹھ، نو۔۔۔''

''بادشاہو، یہاں آ کر گن لو، بارہ ہیں بارہ، دو آگے بھی ہیں''۔

سپاہی ساری گنتی بھول کر سردار جی کے پاس پہنچ گیا۔

''بہت دن بعد دکھائی دیے بادشاہو، کہاں رہے'' کہتے ہوئے اس نے سپاہی سے ہاتھ ملایا تو ایک چھوٹا سا ہلکا ہرے کاغذ کا ٹکڑا اِدھر کا اُدھر ہو گیا۔ جس کی نظر پڑ گئی اس نے پہچان لیا۔ پانچ کا نوٹ تھا۔

''دو مہینے اُدھر لائن حاضر کر دیا گیا تھا، جبھی تو کڑکی ہو گئی، نہیں تو تجھے روکتا''۔

اس نے نوٹ سفید پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ مسکرایا، ایک بار پھر ہاتھ ملایا اور بولا

''اچھا بڑھ آگے، ہری بتی ہو گئی''۔

دفتر میں داخل ہوا تو پونے گیارہ بج رہے تھے۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں اس لمبی سی میز کی طرف بڑھا جس کے چاروں طرف اور بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میری

کرسی کے سامنے میز پر پرانے سے پیپر ویٹ کے نیچے ایک چھوٹا سا کاغذ دبا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ اس لیے میں نے اُسے نکال کر پڑھنے میں کوئی جلدی نہیں دکھائی اور اپنی کرسی پر جس کا ایک بازو ٹوٹا ہوا تھا بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا، دو ایک لوگوں کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی، معلوم نہیں اپنی کوشش میں کامیاب ہوا بھی یا نہیں لیکن کسی دوسرے چہرے پر مسکراہٹ دکھائی نہ دی۔ ایک بار پھر دائیں بائیں اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہروں پر ایک نظر ڈالی اور اُٹھ کھڑا ہوا تو رکھب داس، جو تھا تو کام چور لیکن دن بھر نیچے کی فائلیں اوپر اور اوپر کی فائلیں نیچے کیا کرتا تھا، جیسے بہت کام کرتا ہو، کھنکھارا، کوئی دھیمے سے ہنسا بھی لیکن میں اسے دیکھ نہ سکا اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتا بڑے صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا اور دروازے کے دونوں جھولتے ہوئے آدھے پٹوں میں سے ایک کو ذرا سا اپنی طرف کر کے منمنایا۔

''مے آئی کم اِن سر؟''

بڑے صاحب نے مجھے دیکھ تو ضرور لیا ہوگا، میری آواز بھی سُنی ہوگی، لیکن کوئی جواب نہیں دیا اور کرسی کی پشت پر ذرا سا زور دے کر دیوار پر ٹنگے ہوئے کلینڈر کو دیکھنے لگے۔

''مے آئی کم اِن سر؟'' میں دوبارہ منمنایا۔

اُنہوں نے میری طرف دیکھے بغیر غصّے سے کہا

''کم اِن ـــــ''

''سر ـــــ''

''یاد نہیں دو وارننگس مل چکی ہیں''

''سر ـــــ''

''یو آر سسپنڈیڈ!''

''سر ـــــ'' میں گڑگڑایا۔

''وہی پرانا بہانا ہوگا۔ ٹیمپو نہیں ملا، دو چوراہوں پر ٹیمپو کو بہت دیر رُکنا پڑا۔ گھر سے ایک گھنٹہ پہلے کیوں نہیں نکلتے؟''

''سر، میرا بخار ابھی ٹوٹا نہیں ہے، کمزوری بہت ہوگئی ہے، اسی لیے بچّوں کو پڑھانے نہیں آسکا۔''

جانے کہاں سے اتنا اچھا بہانہ ہاتھ لگ گیا۔

''سر، اب میری طبیعت پہلے سے ٹھیک ہے۔ دو دن بعد سے بچّوں کو پڑھانے ضرور آؤں گا''۔

''گو ٹو یور سیٹ اینڈ۔۔۔۔''

میں اُن کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی جھولتے ہوئے آدھے دروازے کا ایک پٹ ہاتھ سے چھوڑ کر باہر آ گیا۔۔۔ رومال سے دوبارہ چہرے کا پسینہ پونچھا اور ہال میں بیٹھے ہوئے سارے لوگوں پر ایک اُچٹتی ہوئی لیکن فاتحانہ نظر ڈالی، حاضری کے رجسٹر پر دستخط کیے، اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا اور کام شروع کرنے کے لیے ایک فائل اُٹھانے والا تھا کہ بڑے صاحب کے بچّوں کو پڑھانے کے لیے اُن کے گھر جانے کا خیال آ گیا اور میں کانپ گیا۔

صاحب کو شک بھی ہو گیا تو غضب ہو جائے گا۔ نوکری تو جائے گی ہی، صاحب کسی معاملے میں پھنسا بھی سکتے ہیں، میں نے سوچا اور چور نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی میری حالت بھانپنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے

اسٹور کیپری ویسے ہی کوئلے کی دلاّلی ہے، اور افسر بھی بے ایمانی میں شامل ہو جائے تو سمجھو گردن ہر وقت سولی پر لٹکی ہے۔ سارے سامان کا حساب کتاب میرے پاس ہی رہتا ہے، اور اسٹور کی چابی بھی۔ جو بھی سامان آتا ہے، رسید میں ہی دیتا ہوں، اسٹاک رجسٹر میں نوٹ بھی میں ہی کرتا ہوں۔ لیکن رجسٹر کچھ کہتا ہے اور اسٹاک کچھ۔ کاغذ کے ریم آتے ہیں چھ اور لکھے جاتے ہیں دس، یہی حال دوسری چیزوں کا بھی ہے، قلم، پینسل، بجلی کے بلب، ٹیوب لائٹ اور دفتر کی ضرورت کی باقی ساری چیزیں۔

بڑے صاحب تو جب چاہیں جیل کے پیچھے بھیج سکتے ہیں مجھے۔

جیل کے خیال ہی سے میری پیشانی پسینے سے تر ہوگئی اور اسے میں نے دوسروں کی نظریں چرا کر رومال سے پونچھ لیا۔

سورج بھان چپراسی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا "بہت پریشان ہو راج جی۔ کا ہوا؟ صاحب نے بس ڈانٹ ہی تو پلائی ہے، سو اس سے کیا ہوتا ہے۔ افسر ہیں، سُن لیا کرو، ایک کان سے اور دوسرے کان سے نکال دیا کرو۔ اور کیا کر لیں گے، بس ڈانٹ ڈپٹ ہی تو کریں گے۔ کا او نہیں جانت کہ سب جانت ہیں۔ کچھ روب داب تو انہوں کو دکھانا ہے۔ سمجھے گے ناہیں۔"

وہ شرارت سے ایک بار پھر مسکرایا۔ "بچوں کو پڑھانے کا ہے نہیں جات، پھیس نہیں ملتی؟ چے چے، اتی سی بات نہیں جانت۔ پھیس تو مل ہی جائے گی، صاحب دیں کہ میم صاحب۔ صاحب بھول جائیں تو میم صاحب سے لے لو، کا صاحب جانت ناہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے ہال کے دروازے کی طرف دیکھا "لو تمہاری دپھتر کی پھیس تو آ گئی، ۔۔۔ نکدا نگد ۔۔۔ ترنت گن لو، کن ٹن میں جا کے ۔۔۔ چاہو نہ گنو، رجوؔ کے لیھا پھے میں ایک پیسہ کم نہیں ہو سکت۔"

گول چہرے پر رنگے ہوئے بالوں اور اندر دھنسی ہوئی آنکھوں والا رجنی شرما آفس میں ہمیشہ ہنستا ہوا داخل ہوتا۔ وہ ہنستا تو اس کے ہاتھ کا تھیلا بھی اوپر نیچے ہونے لگتا، جیسے اس کی نقل کر رہا ہو۔ نام تو اس کا شرما تھا لیکن جانے کیوں لوگ اسے رجوؔ کہتے تھے۔

میں نے سامان چیک کرنے کا ڈرامہ کرنے کے لیے گودام جانے کا ارادہ کیا تو بولا "سامان سب ٹھیک ہے"۔ میں نے اس کی بات مان لی اور بل پر اس اُمید پر دستخط کر دیے کہ خوب موٹا لفافہ ملے گا تو اس قرض کی جو پتا جی چھوڑ گئے تھے دو چار مہینے کی قسط ایک ہی بار میں ادا کر دوں گا۔

لفافہ دیے بغیر جاتے وقت اُس نے میرے چہرے پر لکھی ہوئی مایوسی پڑھ لی اور ایسے بولا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''سامان تو سارا کل ہی آ گیا تھا، آپ تھے نہیں، اس لیے لفافہ صاحب نے
لے لیا تھا اور کہا تھا کہ بل پر دستخط کل آ کے کرا لینا۔ میں اس سے سمجھ لوں گا۔''

دھوپ کا چشمہ آنکھوں سے اُتارتے ہوئے مس روزی جیسے ہی دفتر میں داخل ہوئیں ساری نظریں اُن کی طرف مڑ گئیں، لیکن بس ایک لمحے کے لیے، جیسے یہ محض اتفاق ہو۔ اس کے بعد کچھ آنکھیں فائلیں دیکھنے لگیں، کچھ یکا یک گھڑی کی طرف مڑ گئیں اور دو تین دوسرے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے ایسا منہ بنانے لگے جیسے انھیں زوروں کی چھینک آ رہی ہو۔

دفتر کے سارے ہی لوگ، ایک دوسرے کی نظریں چرا کر، روزی کو دیکھتے بھی ہیں اور اس سے ناراض بھی رہتے ہیں۔ دوسروں کی طرح دفتر میں نوکری وہ بھی کرتی ہے لیکن اس سے کبھی نہیں پوچھا جاتا کہ ساڑھے بارہ بجے دفتر آنے کا وقت ہے یا کل تم شارٹ لیو لیے بغیر تین بجے ہی کیوں چلی گئیں تھیں۔

آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ اپنی سیٹ تک پہنچی، سارے دفتر کا جائزہ لیا۔ اسی وقت سورج بھان نے ٹھنڈے پانی کا گلاس میز پر رکھ دیا تو وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر پانی پینے لگی۔

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی، الماری کا تالا کھولا، ایک فائل نکالی، اس میں سے ایک کاغذ نکال کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا، دو نئے کاغذ فیتے سے کس کے فائل کا حصہ بنا دیے۔ پھر چھٹی کا رجسٹر کھولا، چپراسی سے حاضری رجسٹر منگایا، چھٹیوں کا حساب کیا اور پھر میری طرف کچھ اس طرح دیکھا جیسے کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو۔

میں کرسی سے اُٹھ کر اُس کی طرف لپکا۔

''مسٹر (وہ ہر ایک کو مسٹر ہی کہتی، نام کا کسی کا نہ لیتی) کیزوال لیو تو آپ پہلے ہی ختم کر چکے ہیں اور سِک لیو بھی۔ اب صرف گیارہ دن کی اَرنڈ لیو بچی ہے''۔

جی تو چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ تیری تو ساری کی ساری اَرنڈ لیو باقی ہو گی

کیوں کہ تجھے تو چھٹی لیے بغیر ہی چھٹی مل جاتی ہے اور ہر سال ارنڈ لیو کیش کرا لیتی ہے۔۔۔۔ لیکن ہمت نہیں ہوئی۔

روزی خوبصورت تو کچھ ایسی خاص نہیں لیکن جوانی اور اداؤں نے گہرے گندمی رنگ پر جیسے پردہ ڈال دیا ہے۔ صاحب سے اپنی قربت کی دھونس تو ہم پر نہیں جماتی لیکن ایک فاصلہ ضرور رکھتی ہے اور ہمیں دل ہی دل میں جلنے، اس سے خفار ہنے اور اپنے آپ کو چوتھے درجے کا ملازم سمجھنے کے لیے یہی کافی ہے۔ سامنے تو کچھ کہنے کی ہم میں ہمت نہیں لیکن جب بھی پیٹھ پیچھے اُس کا ذکر کرتے ہیں اور یہ ہوتا ہی رہتا ہے تو اسے کالا گلاب ہی کہتے ہیں اور کینٹین میں یہ کالا گلاب کالی گلاب جامن ہو جاتا ہے۔

دفتر میں ویسے تو بڑے بابو بھی ہیں لیکن اُن کی حیثیت ہم کلرکوں سے کچھ بھی بہتر نہیں۔ اُن کے سارے کام تو ایک ایک کر کے کالے گلاب جامن کے شیرے میں تیرنے لگے تھے۔ لیکن اس کا ایک فائدہ بھی تھا۔ کبھی کبھی ہمارے ہنسی مذاق میں وہ بھی شامل ہو جاتے ہیں، خاص طور سے اُس وقت جب وہ دفتر میں ہوتے ہوئے بھی اپنی سیٹ پر نہ ہوتی۔

تھوڑی دیر میں سورج بھان بڑے صاحب کے کمرے سے مسکراتا ہوا نکلا، مس روزی سے کچھ کہا اور وہ دو تین فائلیں، دو چار لفافے اور ایک رجسٹر لے کر ان کے کمرے میں چلی گئی اور سورج بھان نے خس کی ٹٹی دروازے پر لگا کر اس پر پانی کا چھڑکاؤ شروع کر دیا۔ دروازے پر خس کی ٹٹی لگا دینے کا مطلب تھا کہ اب کوئی اندر نہیں جا سکتا اور نہ کسی کی پیشی ہی ہو گی۔

سورج بھان ٹیلی فون پہلے ہی باہر لے آیا تھا اور خس کی ٹٹی پر پانی چھڑکنے اور ہر فون کے جواب میں یہ کہنے کے لیے کہ ''صاحب میٹنگ میں ہیں اور مجھے اندر جانے کی آگیا نہیں ہے''، اُس نے اپنے آپ کو صاحب کے کمرے کے باہر رکھی ہوئی ٹوٹی پھوٹی کرسی پر جما لیا۔۔۔۔

کئی لوگ ایک ساتھ کھڑے ہو گئے اور کاغذوں اور فائلوں پر بھدے پیپر ویٹ

اور پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ڈھیلے رکھنے لگے تو میری کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے بدن کو کچھ اس طرح ہلایا ڈلایا کہ کوئی چاہے تو یہ سمجھ لے کہ میں اُٹھنے والا ہوں اور چاہے تو یہ کہ میں کمر جھکائے جھکائے تھک گیا ہوں اور اب سر سیدھا کر کے بیٹھنا چاہتا ہوں۔

اسی وقت کسی نے کہا ''کین ٹین نہیں چلنا؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں؟'' میں نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اصل میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ خس کی ٹٹی لگنے کے بعد کین ٹین جانا ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ہے کہاں۔ اس لیے میں پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

یہ باتیں شاید نئے پرنس کے پاس ہی چھوٹ گئی تھیں۔

بچّوں کو آخری بار پڑھانے میں گیارہ بارہ دن پہلے گیا تھا، اگلے دن مکان کے پاس تک جا کے لوٹ آیا تھا اور بخار کا بہانہ بنا کر دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔۔۔۔ اُس وقت میں جو بھی تھا، کبھی کبھی اُس کی دھندلی سی یاد آجاتی ہے۔ لیکن اس وقت، اُن دنوں جو بھی ہوا تھا، ہوتا رہا تھا۔۔۔۔ اس کا بہت کچھ یاد آرہا ہے، اچھا بُرا، کھٹا، میٹھا۔ کبھی خیال ہوتا ہے کہ بہت کچھ بدل گیا ہے، کبھی سوچتا ہوں، سب کچھ۔

لیکن وہ سلسلہ اس سے پہلے شروع ہوا تھا۔

پیاس مجھے یوں ہی زیادہ لگتی ہے۔ پانی کے لیے کہتا تو کبھی پولو خود لے آتا، کبھی نوکر کو آواز دے کر منگا لیتا۔ دبلی پتلی ریشم جو ابھی بہت چھوٹی ہے، سر جھکائے جھکائے، گندھی ہوئی چوٹیاں گردن کے دونوں طرف جُھلاتی ہوئی، کاپی پر اے، بی، سی، ڈی لکھتی رہتی۔

اس دن مجھے پیاس لگی تو اُس نے نوکر کو پکار کر پانی لانے کے لیے کہا۔ نوکر شاید کہیں گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بیگم صاحب طشتری میں شربت کا گلاس لیے خود ہی

آگئیں۔ شاید کہیں جانے کو تیار تھیں، بنی، سنوری۔ میں انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اُنہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا، گلاس آگے بڑھایا۔ میں نے گلاس ہاتھ میں لیا تو اُن کی ایک اُنگلی نے میرے ہاتھ کو نرم مخملی لمس سے اپنے وجود کا احساس دلایا۔ میری پیشانی پر قطرے اُبھر آئے۔

''ارے آپ کھڑے کیوں ہو گئے ہیں''؟ اُنہوں نے کہا ''تشریف رکھیے۔'' اور پاس کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

میں نے شربت پی لیا تو اُٹھ کر اُنہوں نے خود ہی گلاس میرے ہاتھ سے لیا اور وہی سب کچھ ہوا جو تھوڑی دیر پہلے ہو چکا تھا۔

اُسی وقت اُنہوں نے کہا۔ ''ماسٹر صاحب! آپ نے پولو کے منتھلی ٹیسٹ کے نمبر دیکھے۔ آپ پڑھاتے ہیں کہ گھول کر پلا دیتے ہیں۔۔۔ آپ تو جادو کر کے جس کو چاہیں اپنے بس میں کر لیتے ہیں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اُنہیں واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر اُنھوں نے پردہ برابر کرتے ہوئے ایک بار پھر میری طرف دیکھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

اس کے بعد وہ یہ دیکھنے کے لیے کہ میں بچّوں کو کیسے پڑھاتا ہوں ہر دوسرے تیسرے آ جاتیں۔ ایک دن ریشم کی ڈرائنگ کاپی پر چڑیا بنانے کے لیے اُنہوں نے پینسل میرے ہاتھ سے کچھ ایسے لی کہ کرسی کا ہتھا درمیان میں نہ ہوتا وہ تو شاید مجھ پر ڈھے جاتیں۔

لیکن اُس شام، جس کے بعد میں نے بیماری کا بہانہ بنا کر دفتر سے چھٹی لے لی تھی، جو ہوا۔۔۔

پولو اپنے کسی دوست کی سالگرہ پارٹی میں گیا تھا۔ ریشم بھی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ یہ معلوم ہونے کے بعد میں لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ نوکر نے ایک

دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ ''بیگم صاحبہ نے کہا ہے آپ کو یہاں بٹھا دوں۔'' اُس نے کہا۔

''پولو کتنی دیر میں لوٹ آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا صاحب۔ بیگم صاحب سے پوچھیے گا۔ وہ جانتی ہوں گی۔''

یہ کمرہ وہ نہیں تھا جس میں روز پولو کو پڑھاتا تھا۔ یہ بہت خوبصورت لیکن ذرا چھوٹا تھا۔ صوفہ تو تھا ہی، مسہری بچھی تھی۔ دروازے دو تھے، ایک اندر کھلتا تھا، دوسرا گیلری میں جس کے شروع میں اس کمرے کا دروازہ بھی تھا جس میں بچے پڑھتے تھے۔ دونوں دروازوں پر خوبصورت پردے لٹک رہے تھے، کھڑکیوں پر بھی، جو بند تھیں۔ میں بے وقوفوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں پردہ ذرا سا کھسکا کر بیگم صاحبہ داخل ہوئیں۔ آج بھی شاید کہیں جانے کے لیے تیار تھیں، مہک رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں لیکن جیسے ہی پردہ کی سرسراہٹ سے انھیں نوکر کی موجودگی کا اندازہ ہوا مسکراہٹ کی جگہ سنجیدگی نے لے لی۔ نوکر دونوں ہاتھوں میں ٹرے تھامے تھا، اس لیے پردہ اس کے کندھے پر ذرا دُور تک کھنچ آیا تھا اور جب ایک دم اپنی جگہ پر لوٹا تو دبیز کپڑے نے جتنی آواز پیدا کی اسے سرسراہٹ ہی تو کہا جائے گا اگرچہ آواز کچھ زیادہ تھی۔ اصل میں اُنھیں ہوشیار اسی آواز نے کیا تھا۔

جیسے ہی انھوں نے دیکھا کہ میں ان کے احترام میں کھڑا ہونے جا رہا ہوں وہ جلدی سے سامنے کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اس دوران جب ملازم درمیان کی میز پر ناشتہ سجا رہا تھا، بلکہ تقریباً سجا چکا تھا، انھوں نے کچھ اس طرح جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یکایک یاد آ گئی ہو، اس سے کہا۔

''تکیے کے نیچے ایک لفافہ رکھا ہے، لے آؤ۔''

نوکر لفافہ لے کر آیا تو اُنھوں نے اُسے پتا سمجھایا اور حکم دیا ''جاؤ، فوراً دے آؤ۔ دیر نہ لگانا، جہاں جاتے ہو اٹک جاتے ہو۔۔۔ ایک گھنٹے سے زیادہ نہ لگے۔ ایک گھنٹہ بھی زیادہ ہے۔''

نوکر چلا گیا تو مجھ سے مخاطب ہوئیں " پتھا آپ کو پتہ ہے میٹنگ کب تک ختم ہوگی؟ کوئی ضروری میٹنگ ہے؟"

میں گڑبڑا گیا، لیکن میں نے ہوشیاری برتی۔

" میٹنگ کا کیا، کبھی ضروری میٹنگ جلدی ختم ہو جاتی ہے اور کبھی معمولی بھی لمبی کھنچ جاتی ہے۔ فون کر لیجیے۔"

" کیا تھا، " وہ مسکرائیں۔" چپراسی نے کہا وہ اندر نہیں جا سکتا۔"

" آپ کے کام کا شام کی اس میٹنگ سے کوئی تعلق نہیں؟"

" جی میں ۔۔۔۔ میرا کیا کام، میں تو بس جونیئر کلرک ہوں؟" میں بری طرح اُلجھ گیا لیکن میں نے یہ نہیں بتایا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

وہ پھر مسکرائیں " جی ہاں آپ کا کیا کام، ساری ضروری فائلیں تو مس روزی کے پاس رہتی ہیں۔"

میں کیا کہتا۔ خاموشی سے اُنہیں ٹک ٹک دیکھتا رہا۔

" ارے آپ نے کچھ لیا نہیں؟" اُنہوں نے صوفے سے اُٹھ کر ایک پلیٹ میری طرف بڑھائی اور " ابھی آئی" کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

وہ لوٹیں تو ایک چھوٹی سی ٹرے، جس میں دو گلاس اوپر تک بھرے تھے اور جھاگ چھلک رہا تھا، اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اُنہوں نے ٹرے میز پر رکھی اور صوفے پر مجھ سے تقریباً لگ کر بیٹھ گئیں۔ میں ذرا سا سکڑا تو مسکرا دیں۔ ایک گلاس میرے ہاتھ میں دے دیا اور دوسرا خود لے کر اُنہیں ٹکرایا تو گلاس کم ٹکرائے اور ہم دونوں زیادہ۔ میں پسینہ سے شرابور ہو گیا۔

گلاس میں کیا تھا یہ میں جانتا تھا، ایک آدھ بار چکھ بھی چکا تھا، لیکن اس طرح نہیں۔ اُنہوں نے مجھے ہچکچاتے ہوئے دیکھا تو اپنے گلاس سے ایک چسکی لی اور اُسے میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ یہی اُنہوں نے اپنے گلاس کے ساتھ بھی کیا۔ پہلے اُس نے میرے ہونٹ چھوئے اور پھر اُن کے۔

تھوڑی دیر بعد دروازے، کھڑکیاں، دیواریں، دیواروں پر لگی تصویریں، بیگم صاحب اور خود میں اپنی جگہ تھے بھی اور نہیں بھی۔۔۔۔ میں نے اُٹھنا چاہا تو اُنہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''پہلے مجھے اُٹھاؤ'' اُنہوں نے کہا اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

یکایک مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے دروازہ دپاٹوں پاٹ کھول دیا ہے۔ میں جبرا کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن کوئی تھا نہیں۔

''کیا ہوا؟'' اُنہوں نے ہاف سلیوز کے بلاؤز کی ایک آستین نیچے سے کھینچ کر سلوٹیں دور کرتے ہوئے کہا۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کچھ کہتے نہیں بنتا تھا۔ مُنہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے۔

''صاحب آ گئے، مجھے دیکھ لیا تو میرا۔۔۔۔ میری نوکری کا کیا ہو گا؟''

وہ ہنسیں، کھلکھلا کر۔ پھر میرے گالوں کو چھوتے ہوئے بولیں۔

''مین گیٹ پر نوکر خس کی ٹٹی پر پانی ڈال رہا ہے سمجھے۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟''

رُخصت کرتے ہوئے اُنہوں نے ایک لفافہ میری جیب میں ڈال دیا۔

''یہ کہاں پہنچانا ہے؟''

انھوں نے شرارت سے دیکھا، لیکن کچھ بولیں نہیں۔

''پورا پتہ تو اس پر لکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ہنس دیں ''جو نہ لکھا ہو خود لکھ لینا، تم تو سارے پتے لکھ لیتے ہو۔''

دفتر سے گھر جاتے ہوئے راستے بھر یہی سوچتا رہا کہ صاحب کے بچّوں کو پڑھانے جاتا رہا اور بچے جب بھی گھر پر نہ ہوئے، یہی ہوتا رہا اور میں بیگم صاحب کی مرضی پر چلتا رہا تو کسی نہ کسی دن صاحب کو سب کچھ پتہ لگ ہی جائے گا، اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اور بیگم صاحبہ کی بات نہ مانی اور انھوں نے خفا ہو کر صاحب سے اُلٹی سیدھی لگا دی

تو صاحب جیل ہی بھجوا ہی دیں گے۔

یہی سوچتے سوچتے گھر پہنچا تو گیٹ کے تالے میں ایک کاغذ پھنسا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس میں کیا لکھا ہے اس لیے کھول کے پڑھا نہیں۔ جیب میں رکھ لیا۔ بستر پر لیٹ کر پڑھوں گا۔ ہزار روپے ہر مہینے تو دیتا ہوں۔ پیچھے پڑا ہے ہزار کے دو ہزار کردوں۔ کہاں سے کردوں؟ میں نے سوچا۔ پرچہ پڑھا تو میں اُس میں پانچ ہزار مانگے تھے۔ لکھا تھا پانچ ہزار دے دو تو آدھے پیسے ادا ہو جائیں گے۔ سود بھی آدھا ہو جائے گا۔ تمہارے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ بات نہیں مانی تو۔۔۔۔''

اس کے آگے کچھ نہیں لکھا تھا۔ نام بھی نہیں تھا۔ لیکن میں اُسے جانتا تھا۔ پتا جی کے دوست نے روپے وصول کرنے کا ٹھیکہ اُسی کو دیا تھا۔ ہر مہینے روپے لینے کے بعد بھی پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول ایسے گھماتا ہے کہ پسینہ آجاتا ہے۔

میں نے پنکھے کی رفتار تیز کردی۔ پرچہ ایک بار پھر پڑھا۔ لکھا تھا گھنٹے بھر بعد پھر آؤں گا۔ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا اور بغل کے دروازے سے نکل کر گیٹ پر تالا ڈال دیا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چپکے سے اندر آکر دروازہ بند کرلیا۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے چائے بھی نہیں بنائی کہ بجلی جلانا پڑے گی اور اس وقت وہ آگیا تو روشنی دیکھ کر سمجھ جائے گا اور دو چار آوازیں لگانے کے بعد بڑی بڑی گالیاں دے گا۔

اُسی وقت میری نظر اُس پر پڑی۔ ٹانگیں پھیلائے کیسا آرام سے لیٹا ہوا ہے۔ میرا دل مارے ڈر کے دھک دھک کر رہا تھا اور اسے کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ مجھے غصہ آگیا۔ لیکن کیا کرسکتا تھا علاوہ اِس کے کہ اُسے باہر نکال دوں۔ کم سے کم بھونکنا تو پڑے اُسے۔

ویسے پرنس کو اپنی پہلی جُون کی باتیں کچھ ایسی خاص یاد نہیں تھیں لیکن کبھی کبھی کچھ پرانی باتوں کا سایہ سا جیسے سر کے بہت اوپر سے گذر جاتا۔ اُسے ایک دم یاد آگیا کہ یہ روپے اُدھار تو میرے پتا جی نے لیے تھے، جب ماتا جی بہت بیمار تھیں، بہت علاج کرایا تھا، پھر بھی وہ بچ نہ پائی تھی اور کچھ دنوں بعد پتا جی بھی پرلوک سدھار گئے تھے۔

اتنے میں وہ آ گیا گھنٹی بجائی ہی تھی کہ اُس کی نظر تلے پر پڑی۔ لگا اول فول بکنے۔
پہلے تو پرنس کو بڑا مزا آیا اور اُس نے دل ہی دل میں کہا" کیسے نخرے کرتا تھا دودھ پینے میں۔ بلّی پی جاتی تھی تو دودھ دوبارہ دینا پڑتا تھا۔ اب گالیاں پڑ رہی ہیں تو خود سُنے۔ میں کیوں بھونکوں۔" لیکن پرانی نفرت ایک دم جاگ پڑی اور اُسی کی طرف مُنہ کر کے وہ خوب زور زور سے بھونکنے لگا اور دل ہی دل میں خوش بھی ہوا۔ پہلے اس کے سامنے گھگھیاتا تھا، آج اُس پر بھونک رہا ہوں۔ یہ آزادی پہلے کہاں تھی۔ اُسے اپنی حالت پر اطمینان محسوس ہوا۔

خوب اندھیرا چھا گیا تو میں نے سمجھ لیا اب وہ تیسری بار نہیں آئے گا۔ میں نے بجلی جلائی، چائے کا پانی اسٹوو پر چڑھایا اور دروازہ ذرا سا کھول کر پرنس کے اندر آنے بھر کی جگہ بنا دی۔

بستر پر لیٹے لیٹے میں نے چائے کا ایک گھونٹ لیا ہی تھا کہ پرنس نے اگلے دونوں پیر پلنگ پر ٹکا کر اپنی تھوتھنی بڑھائی اور میرا ہاتھ چھونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں تکیہ کھسکا کر اس سے ذرا دور ہو گیا تو اس نے مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ میں کروٹ بدل کر سامنے کی دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ اور وہ بھی اپنے گدے پر لیٹ گیا۔

سچ پوچھیے تو مجھ سے اُس کی محبت برداشت نہیں ہو رہی تھی اور اُس کی بے فکری کی زندگی پر رشک آ رہا تھا۔

■ ■

شرطیں

شرطیں کچھ ایسی سخت نہ تھیں۔

''پیاز کمرے میں نہیں آئے گی۔''

''ماس کا تو پرشن ہی نہیں۔''

''ٹھیک ہے''۔ اس نے کہا، جیسے بغیر کچھ سوچے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ دونوں باتیں اس نے سنی بھی تھیں یا نہیں۔ شاید پوری بات سُنے بغیر اس نے جلدی سے ہاں کہہ دیا تھا جس سے یہ پتہ لگ ہی گیا تھا کہ وہ کمرا جلدی سے جلدی حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ یہ بات چاچی کو بھی لگی تھی کہ شاید اس نے سُنا نہیں لیکن انھوں نے سوچا تھا ہمیں اس سے کیا کہ اس نے سنا یا نہیں سنا۔ ''ہاں'' تو کہہ ہی دیا ہے اس نے۔

ویسے آدمی ٹھیک ٹھاک ہی لگتا ہے۔ اب اندر سے گڑ بڑ ہو تو کوئی کیا جانے۔ کوئی من کے اندر تو جھانک کے دیکھ نہیں سکتا، چاچی نے سوچا۔ کوئی لڑکی تو بیاہنا نہیں ہے، وہ ہنسی۔۔۔۔۔۔ دو تھیں، بھگوان کی کرپا سے اب اپنے اپنے گھر کی ہیں۔۔۔ یہ

سب سوچ کر ہی اس نے کمرا دکھانے کا من بنا لیا۔

پچھلے کرائے دار نے بہت پریشان کیا تھا، اسی لیے وہ ایک ایک بات سوچ کر، کر رہی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ نام جاننے کے بعد اس نے کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ یہ بھلا مانس، پیاز کھائے گا۔ اس نے سوچا تھا۔ لیکن تیسرے ہی دن جب گوشت بھوننے کی چھن من سنائی دی تھی تو اسے بہت بڑا لگا تھا، غصہ بھی آیا تھا لیکن کیا کرتی۔ دو مہینے کی جمع رقم اور ایک مہینے کا ایڈوانس کرایا تو پہلے ہی لے چکی تھی۔ ایک بار تو اس نے سوچا تھا کہ سارے روپے اس کے منہ پر مار دے اور کہے چلتے بنو، نہیں اُٹھانا کرایے پر کمرا مجھے۔ لیکن اسی وقت اسے دو باتوں کا خیال آیا تھا۔ اس نے کہہ دیا، نہیں خالی کرنا کمرا مجھے تو وہ کیا کر لے گی۔ یہ دور کی بات تو خالی بہانہ تھی، وہ خود بھی جانتی تھی۔ اصلی بات تو بالکل دوسری تھی۔ بنیے کا پونے دو مہینے کا اُدھار چکانے اور دوسرے چھوٹے موٹے خرچوں کے بعد اب اس کے پاس مشکل سے چھ سات سو روپے ہی بچے تھے۔ اس لیے غصہ پی گئی تھی اور سوچا تھا اب تین مہینے تو یہ مصیبت بھگتنی ہی ہوگی۔

کمرے کی طرف کا دروازہ اس نے اسی وقت بند کر دیا تھا جب اسے گوشت کی بُو کا اندازہ ہوا تھا، اور تھوڑی دیر بعد کھڑکی بھی۔ وہ گندی سی بُو تو اب نہیں آ رہی تھی لیکن وہ تھی کہ ناک بار بار اندر سے پونچھتی، ایسا لگتا تھا کوئی بدبودار چیز نتھنوں میں چپک گئی ہو۔ داہنے ہاتھ کی چھنگلی کڑوے تیل میں ڈبو کر اس نے نتھنوں میں چاروں طرف گھمائی تھی، پھر لمبے لمبے سانس لیے تھے، یہ جاننے کے لیے کہ بُو اب تو نہیں آ رہی ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک لگا تھا اُسے، لیکن تھوڑی ہی دیر میں جیسے پھر سے کچھ سرسرانے لگا تھا ناک میں اور کانوں میں چھن من ہونے لگا تھا۔ دیواروں اور دروازے سے چھن کر آنے والی یہ آواز دھیمی تو تھی لیکن پھر بھی محسوس ہو رہی تھی۔ رات کو کھانا بھی وہ نہیں کھا سکی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گوبھی کے سالن میں کسی نے ماس ڈال دیا ہو، اور وہ بھی کچا۔

اگلے تین مہینے بڑی تنگی میں گزرے تھے۔ ایڈوانس کرایہ لینے سے انکار کر دیا تھا اس نے، اس اُمید میں کہ دو مہینے بعد اس مصیبت سے چھٹی مل جائے گی۔ کوئی لکھا پڑھی تو ہوئی نہیں، اس لیے وہ سمجھتی تھی کہ کرایہ پورا ہو جائے گا اور میں آگے کے روپے نہ لوں گی تو وہ آپ ہی کمرا خالی کر دے گا۔ لیکن وہ ذرا ٹیڑھا آدمی تھا۔ پریشان کرنا تو اس نے اسی دن سے شروع کر دیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ بڑی بیٹی اور بچے آرہے ہیں۔ اب یہیں رہیں گے۔ حیدرآباد میں بچوں کی پڑھائی چوپٹ ہو رہی ہے۔ دلی میں ساری کتابیں ہندی میں تھیں، وہاں انگریزی کا زور ہے اور بچوں کو اتنی انگریزی آتی نہیں۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ بیٹی بچوں کا تو بس بہانہ ہے، اصل میں بڑھیا مکان خالی کرانا چاہتی ہے، اور کچھ نہیں۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا تھا کہ کہہ دے نہیں خالی کرنا مکان مجھے۔ جو کرنا ہو کر لو، لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہا تھا کہ جھگڑا بڑھا تو وہ اکیلا پڑ جائے گا۔ کالونی میں اس کا ساتھ بھلا کون دے گا؟ پھر بھی پریشان کرنا اس نے اسی وقت سے شروع کر دیا تھا۔۔۔۔ نل کی ٹونٹی کھول دیتا کہ ٹنکی کا سارا پانی بہہ جائے اور آواز اونچی کر کے شکایت کرتا کہ چاچی اپنی تین چار بالٹیاں اور چوکے کے برتن بھر کے موٹر بند کر دیتی ہے۔ کمرے کا دروازہ بار بار کھولتا اور زور سے بند کرتا۔ رات کو باہر کے پھاٹک میں وہ تالا ڈالنے جاتی تو کبھی کبھی بیچوں بیچ کھڑا ہوا ملتا۔ وہ چابی ہاتھ میں لیے انتظار کرتی رہتی۔ کچھ کہتی تو جواب دیتا ایک دوست آنے والا ہے، اس کا انتظار کر رہا ہے۔ لیکن کوئی آتا نہ جاتا، بس ستانے کی بات ہوتی اور کبھی کوئی آجاتا تو دو گھنٹے کی چھٹی ہو جاتی۔ جلدی سونے کی عادی تھی لیکن تالہ ڈالے بغیر کیسے سو جائے۔ کرسی پر بیٹھی آنکھیں ملا کرتی۔

یہ تین مہینے بڑی مشکل سے کٹے، ایک ایک دن کر کے، لیکن کیا کرتی بیچاری، کبھی اپنی حالت پر آنسو آجاتے تو بابو جی سے کہتی۔ جانتی تھی وہ کچھ نہیں کر سکتے، لیکن دُکھ کا تھوڑا سا حصہ جیسے اُدھر چلا جاتا۔ وہ چپ چاپ لیٹے تاکتے رہتے، ہلے ڈلے بغیر۔

غصہ کر کے وہ اپنے کو ہلکان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جانتے تھے کہ ذرا سی گڑبڑ میں ان کی سانس پھولنے لگتی ہے۔ وہ اپنی بات دہراتی تو بابو جی نظریں دھیرے دھیرے اس کی طرف کرتے، ایسا لگتا تھا جیسے چھت سے پلنگ کے کونے تک جہاں وہ بیٹھی ہوتی بیچ بیچ کا زینہ بنا ہو جس پر وہ پیر رکھ کر دھیرے دھیرے اتر رہی ہوں۔ پھر کہتے۔

''اس بار خالی ہو جائے تو پھر کمرہ کرائے پر نہ اٹھانا۔۔۔ یہ سالے'' وہ چپ ہو جاتے اور سوچتے کہ پہلے کبھی ان کے منہ سے ایسی بات نہیں نکلتی تھی، اور اس کے سامنے تو بالکل نہیں۔ پھر جملہ پورا کرتے ''سمجھتے ہیں ہزار بارہ سو دے کر خرید لیا ہے۔۔۔ آگے کوئی آئے تو کہہ دینا خالی نہیں ہے''۔

یہ بات انھوں نے کہہ تو دی لیکن جانتے تھے ایسا ہو نہیں سکتا۔ وہ بیمار نہ ہوتے، پنشن کے روپوں سے جو چھٹکی کی شادی کے وقت ایک تہائی بیچ دینے کے بعد بس پونے دو ہزار رہ گئی تھی، کسی نہ کسی طرح کام چل جاتا، لیکن۔۔۔ اور اس کے بعد دماغ کے اندر وہ ساری باتیں ہونے لگتیں جو برسوں سے ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ سال میں ایک بار تو بٹیاں آتی ہی ہیں، ان کے بچے بھی، دو چار دن کے لیے داماد بھی آ جاتے ہیں اور یہ دو چار دن بھی کئی مہینوں کا حساب گڑبڑ کر دینے کے لیے بہت ہوتے ہیں، پھر وہ سوچتے کیسی خراب بات دل میں آ گئی۔ چاچی دیکھتیں کہ بابو جی نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لی ہیں تو ان تصویروں کو پہچان جاتیں جو اُن کی آنکھوں کے سامنے سے گذر رہی ہوتیں اور دھیرے سے پلنگ پر سے اُٹھ جاتیں۔

اس نے کمرہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیا تو چاچی نے ڈرتے ڈرتے مسلد ان جی سے کہا۔ ڈرتے ڈرتے اس لیے کہ بابو جی کی بیماری شروع ہونے سے پہلے ایک دن دونوں کے بیچ جھگڑا ہو گیا تھا اور تب سے بات چیت بند تھی۔ لیکن سب کچھ بھلا کر وہ مدد کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوار کا پرشاد جی بھی گھر سے نکل آئے اور اس سے بکّھم بکّھی ہونے لگی۔ تب کہیں جا کر کمرہ خالی ہوا لیکن پورے سوا مہینے کا کرایہ مارا گیا۔

اس کے بعد پورا مہینہ ہونے کو آیا اور کوئی کمرہ ڈھونڈھتا ہوا نہیں آیا تو چاچی نے سوچا To Let کی چھوٹی سی تختی مکان کے باہر لگادے لیکن اس میں بھی تو روپے لگتے اور پھر اسے بنوانے کون جاتا۔ بابو جی نے تو کئی مہینوں سے کھاٹ پکڑ رکھی ہے۔ وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ دو ہی دن بعد یہ آدمی کمرہ ڈھونڈھتا ہوا آ گیا تھا۔

کمرہ چودہ فٹ لمبا اور دس گیارہ فٹ چوڑا تھا۔ غسل خانہ کے لیے تھوڑی سی جگہ آنگن کی لے لی گئی تھی لیکن اس کا دروازہ اندر سے کھلتا تھا۔ دیواروں میں دو الماریاں تھیں۔ دوسرے کونے میں گیس کا سلنڈر رکھنے کے لیے جگہ بنی تھی اور ایک چوڑا سا پتھر دو دیواروں میں اس طرح چُن دیا گیا تھا کہ ڈھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اصل میں یہ جگہ چھت کے زینے کے نیچے کی تھی جسے کمرے میں شامل کر کے چھوٹا سا باورچی خانہ بنا دیا گیا تھا۔

کمرے کی خوبیوں اور دوسری سہولتوں کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا گیا۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ آنگن کرایے میں شامل نہیں ہے لیکن جاڑوں میں نہانے کے بعد اور ویسے بھی دھوپ کھانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اور گرمیوں میں سونے کے لیے بھی۔ لیکن پلنگ صبح صبح ہی اٹھالینا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ دن بھر باہر ہی پڑا رہے اور کوئی مہمان آجائے تو کہے چاہے نہیں لیکن دل میں سوچے کہ کیسے پھوہڑ لوگ ہیں، پلنگ دھوپ میں پڑا ہوا ہے۔ اُسے کیا معلوم ہوگا کہ یہ کام کرائے دار کا ہے۔

جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اتنا کچھ سننے کے بعد بھی اس نے پوچھا تھا ''رات کو سو سکتے ہیں نا یہاں؟''

''ہاں ہاں''، کیوں نہیں، لیکن پلنگ......''

''پلنگ'' کا لفظ کانوں میں پڑتے ہیں اسے پوری بات یاد آ گئی تھی اور یہ بھی کہ اس کا دماغ اس وقت کہیں بھٹک گیا تھا۔

''لیکن مچھر دانی کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ مچھر بہت ہیں اور بڑے بڑے۔''

وہ ہنس دیا تھا۔

اس کی ہنسی میں چاچی کو خطرے کی گھنٹی بجتی سنائی دی تھی اور اس نے بات صاف کر دی تھی۔

''یہ رعایت ہے، ادھیکار نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کرائے دار اچھا ہو تو ہم اسے تکلیف نہیں ہونے دیتے ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔''

بات صاف تھی۔

اس نے سر ہلایا، جیسے سب کچھ سمجھ گیا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ اور تھا بھی یہی۔

یہ سہولتیں نہ ہوتیں تو بھی وہ ساری شرطیں مان لیتا کیوں کہ اسے کسی ایسی جگہ کمرا چاہیے تھا جہاں عزّت دار لوگ رہتے ہوں۔ یہ مجبوری تھی۔ کوئی بتائے نہ بتائے پتہ چل ہی جاتا ہے۔ اس نے سوچا۔

اس کے چہرے کے بھولے پن کو چاچی نے مسکراہٹ سمجھا، ایسی مسکراہٹ جسے چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہو اور یہ بات اسے کچھ اچھی نہیں لگی۔ اس لیے اس نے وہ ساری شرطیں دہرا دیں جنھیں وہ پہلے ہی مان چکا تھا۔

اس بار بھی یہی ہوا تھا۔ جس چیز کو چاچی بڑی رکاوٹ سمجھ رہی تھی وہ اس کے لیے کچھ تھی ہی نہیں۔ گوشت وہ کھاتا نہیں تھا اور پیاز کی بو اسے بہت بری لگتی تھی۔

بجلی اور پانی کے پیسوں کی بات بھی طے ہو گئی۔ پچھلے کرائے دار کے تجربے کی وجہ سے وہ ایک ایک بات گھما پھرا کر دو دو بار کہہ رہی تھی۔

''سب میٹر لگا ہے۔ لیکن حساب خالی میٹر کی سوئیوں سے نہیں ہوگا۔ ریٹ جو بھی ہو اس پر ٹیکس بھی لگتا ہے اور تار ٹوٹ جائے یا اور کچھ ہو جائے تو بجلی ٹھیک کرنے والا پچاس سے کم نہیں لیتا۔ اور پھر پانی کا موٹر چلانے میں بھی تو بجلی خرچ ہوتی ہے۔ جب موٹر چلے تو دیکھ لو۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی سوئی کو پیچھے سے دوڑا رہا ہو۔''

کوئی بات کہو، ماننے میں ذرا دیر نہیں لگاتا۔ چاچی نے سوچا، فوراً ہامی بھر لیتا

ہے۔ کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں۔ پچھلا والا ابھی تو جب کمرہ ڈھونڈھتا ہوا آیا تھا کیسا سیدھا لگتا تھا۔ کیا کرے، کیسے دل میں گھس کر اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لے؟ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی تو اس نے ایک اور طرح سے آزمایا۔

''پتائی بس سال بھر ادھر ہی کرائی تھی، لیکن پچھلا والا کرائے دار اسٹوو پر کھانا بناتا تھا۔ اس لیے وہ کونا کالا ہو گیا ہے اور پورا کمرہ پیلا پیلا۔ جلدی نہ ہو تو دس پندرہ دن رُک جاؤ، پتائی کرا دوں۔''

کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی تھی لیکن دل ہی دل میں ڈر رہی تھی، کہ کہیں ہاں نہ کر دے۔ پورے کمرے میں سفیدی کرانا پڑی تو کئی دنوں کا کرایہ مارا جائے گا۔ ایڈوانس تو وہ دے دے گا، لیکن اس سے تو بہت سے دوسرے کام کرانے ہیں وہ سب رہ جائیں گے۔

سفیدی کرانے کی بات سن کر وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ اسے کچھ کچھ اُلجھن میں دیکھنا ویسے تو چاچی کو اچھا لگا لیکن انھیں ڈر بھی محسوس ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ جہاں رہتا ہو وہاں سے نکالا جا رہا ہو۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ گھما پھرا کر پوچھ لے لیکن پھر سوچا گھر آئی لکشمی کو ٹھکرانا بھگوان کو بھی اچھا نہیں لگتا ہے۔

اور سب باتیں تو طے ہو گئی تھیں بس کرایے کا اصل معاملہ رہ گیا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اسے کمرے کی جلدی ہے اس نے ذرا چالاکی دکھائی۔ دو سو بڑھا دیے اور ایک بات ایسی کہی جو تھی نہیں۔

''پچھلا والا چودہ سو دیتا تھا۔ بجلی پانی الگ لیکن مہنگائی ہر دن بڑھ رہی ہے۔ کرایہ پندرہ سو ہو گا اور تین مہینے کی جمع رقم دینی ہو گی۔ رہنے کے لیے کوئی چاہے آئے کسی تاریخ کو، کرائے داری پہلی ہی سے مانی جاتی ہے اور اسی دن کرایہ دے دیا جاتا ہے۔ یہ جو بائیں ہاتھ کا چوتھا مکان ہے۔ اس نے دو گھر اِدھر اُدھر کر دیے۔۔۔ وہ تو چار مہینے کی جمع رقم لیتے ہیں لیکن ہم کو دوسرے کی پریشانی کا خیال بھی رہتا ہے۔'' چاچی نے کہا اور سوچنے لگی کہیں زیادہ تو نہیں کہہ دیا؟ کہیں ایسا نہ ہو مجھ سے اُکھڑ جائے۔ تھوڑی

نرم پڑ گئی ''جب بھی کوئی کمرا خالی کرتا ہے تو جمع رقم لوٹا دی جاتی ہے۔اسی وقت ۔۔۔۔ خرچا تھوڑی کی جاتی ہے۔الگ رکھی رہتی ہے۔لیکن کوئی لکھا پڑھی نہیں ہوگی۔''

اپنے جھوٹ پر اسے خود لجا آئی ،لیکن اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔سوا مہینے کا کرایہ تو پچھلے والے نے داب لیا،اور اتنے دن کمرا خالی الگ پڑا رہا۔چار ساڑھے چار ہزار کا نقصان تو ہو ہی گیا۔پیسے نہ بڑھاؤں تو کیا کروں ،جو قرضہ چڑھ گیا ہے کہاں سے ادا کروں گی اور مہنگائی تو ایسا لگتا ہے ہر دن بڑھنے لگی ہے۔پرانا کرایہ ٹھیک بتا دیتی تو بھلا کون وہ سو روپے بڑھاتا۔

نوجوان کو اس نے اوپر سے نیچے تک دیکھا، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کی باتوں کا کیا اثر ہوا ہے تو اسے اپنے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ڈر گئی۔کہیں اس نے دل کی بات جان تو نہیں لی ،اور اسی خیال سے بہانہ بنا دیا،''ابھی آئی ، بابو جی سے پوچھ لوں آج کل ذرا بیمار ہیں۔ویسے کچھ کہتے نہیں۔لیکن بتانا تو چاہیے ہی۔کہیں یہ نہ سوچیں کہ سب طے کر لیا اور مجھے کچھ بتایا بھی نہیں ۔۔۔''

اندر جانے لگی تو بولی ''ارے آپ کھڑے کیوں ہیں ؟ مونڈھے پر بیٹھ جائیے''اور دروازہ کھول کر غڑاپ سے اندر چلی گئی۔

بابو جی کو بتانے کی بات تو بس بہانہ تھی۔پہلے ایک کمرے میں گئی۔پلنگ پر بلاؤز اور پیٹی کوٹ پڑا تھا،انھیں طے کیے بغیر ہینگر پر ٹانگ دیا۔بابو جی کے کمرے میں جھانکا،سو رہے تھے۔دوا کی شیشی سرہانے لڑھک گئی تھی،میز پر رکھ دی۔کلینڈر میں تاریخ دیکھی۔سترہ تھی۔سوچا ابھی آ گیا تو تیرہ دن میں اگلے مہینے کا کرایہ بھی مل جائے گا۔خوش ہوئی اور باہر آ کر مسکراتے ہوئے بولی۔

''پندرہ سو ٹھیک ہیں نا! تم چاہو تو جمع رقم ابھی دے دو۔سامان لے کر آنا تو ایڈوانس دے دینا۔بجلی پانی کا حساب تو مہینے کے آخر میں ہوتا ہے۔''

اس نے جیب سے نوٹ نکالے۔نوٹ سو سو کے تھے۔پہلے تیس گنے،سر اٹھا کر چاچی کی طرف دیکھا،پھر پندرہ اور گنے اور اس کی طرف بڑھا دیے۔

اتنے بہت سے روپے چاچی کے ہاتھ میں آئے تو اندر کی خوشی چھپانا ان کے لیے مشکل ہو گیا لیکن انھوں نے زور لگا کر اسے دل کے آس پاس سے آگے بڑھنے نہ دیا۔ بڑی محنت کرنی پڑی، لیکن کام ہو گیا۔

''کل شام میں یا پرسوں آؤں گا تو ایڈوانس دے دوں گا۔۔۔ کرایہ داری پہلی تاریخ سے شروع کرتی ہیں آپ یا اس دن سے جب۔۔۔۔''

معلوم نہیں تھوڑی دیر پہلے کی بات اسے یاد نہیں رہی تھی یا رعایت چاہتا تھا۔ لیکن چاچی کے دل سے خوشی کی لہریں باہر نکلنے کو اتنی بیتاب تھیں کہ وہ انھیں روکتے روکتے کہی ہوئی بات بھول گئیں اور بولیں۔

''پہلی سے کیوں، اس دن سے جب کرایہ دار آتا ہے کرایہ لگے گا۔'' پھر کچھ سوچ کر بولیں ''ویسے تو کمرہ آج سے تمہارا ہو گیا۔ جب بھی تمہارا جی چاہے آؤ۔ بھگوان جانے، پچھلے سے میں نے اسی لیے انکار کیا تھا کہ تم آنے والے ہو۔'' اس نے بھولا سا جھوٹ بولا۔

''چلیے یہی سہی''

''تو چابی لیتے جاؤ''

چابی کا کیا کروں گا ابھی سے، اسے رہنے دیجیے اپنے پاس'' اس نے کہا اور نمستے کہہ کر چلا گیا۔

اس کے بس میں ہوتا تو سامان لے کر اسی دن آ جاتا لیکن کئی کام نپٹانے تھے اسے۔ کچھ لوگوں کا بجلی کا سامان جو اس کے پاس مرمت کے لیے تھا واپس کرنا تھا۔ ایک تو شام کو آئے گا۔ دو کوئی دن پہلے آ جانا چاہئے تھا لیکن وہ جانے کیوں نہیں آئے تھے اور وہ قیمتی لیمپ اور باہر کا ٹرانزسٹر محلے میں کسی اور کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے گھر میں کام کا سامان تو کم تھا لیکن کاٹھ کباڑ بہت تھا۔ اسے بھی ٹھکانے لگانا تھا اور پھر کچھ لوگوں سے پیسے بھی تو وصول کرنے تھے۔

اس وقت وہ جس مکان میں رہتا تھا، تھا تو پرانا اور مرمت تو دور کی بات سفیدی بھی برسوں سے نہیں کرائی تھی مالک مکان نے، لیکن تھا بڑا۔ اس ایسے تین کمروں کے برابر یا شاید اس سے بھی بڑا۔ کرائے داری پرانی تھی، پتاجی کے زمانے کی اور اس نے مالک مکان کے کہے بغیر کرایا بھی بڑھا دیا تھا اور خوش بھی تھا، لیکن یہ بات سال ڈیڑھ سال اُدھر کی تھی۔ اب تو وہ اسے توڑ کر تین دکانیں نکالنا چاہتا ہے۔ پرانے شہر میں تو گلیوں میں بھی دوکانیں ہوتی ہیں اور خوب چلتی ہیں۔ اس لیے بس یہی رٹ لگائے تھا کہ مکان خالی کر دو۔ محلے والے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

لیکن اصل معاملہ کچھ اور تھا۔ ہوا یہ تھا کہ وہ پولیس کی نظروں میں چڑھ گیا تھا۔ سرور سے اس کی جان پہچان کیسے ہوئی یہ تو اسے یاد نہیں لیکن ہوگئی گہری دوستی۔۔۔۔ اور وہ چوری میں پکڑا گیا۔ مال اس کے پاس سے برآمد ہوگیا تو ایک دن اسے بھی پولیس نے چوکی پر بلایا اور اس کے بارے میں پوچھ تاچھ کرتی رہی۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں ہوا اس دن، لیکن پولیس والوں نے اس کا گھر دیکھ لیا اور جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آتے۔ مانگیں نہ مانگیں، دس بیس لے ہی کے ٹلتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں بار بار دیکھ کر گاہک بھی ٹوٹنے لگے تھے۔ خیر اب اس سب سے چھٹی ملی، اس نے سوچا اور بے کار کی چیزیں ایک کونے میں ڈھیر کرنے لگا۔

سامان سے لدے پھندے دور کشے اور موٹر سائیکل پر وہ خود کالونی میں چاچی کے مکان کے سامنے رکے تو دفتروں سے لوگوں کی واپسی کا وقت ہو چکا تھا۔ کالونی کے کئی لوگ تو جیسے اسے دیکھے بغیر گذر گئے، لیکن دو چار نے رفتار دھیمی کر کے دیکھا بھی اور پاس پڑوس کے کئی مکانوں میں رہنے والوں کو معلوم ہوگیا کہ چاچی کے یہاں نیا کرائے دار آ گیا ہے۔ کالونی کی بات تھی، کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ بھلا یہ کون پوچھتا کہ آنے والے کا نام رام ہے یا رحیم۔

دیکھنے میں بھلا مانس لگتا تھا۔ دن میں اکثر باہر ہی رہتا لیکن سورج ڈوبتے

آ جاتا۔ کبھی کبھی ایک آدھ دوست بھی ساتھ میں ہوتا۔ کبھی یہ ہوتا کہ کوئی دوست رات میں رک جاتا، ہنسی ٹھٹھا ہوتا رہتا۔ ایک دن چاچی کو کیاری میں چھوٹی سی بوتل ملی۔ اٹھا کر سونگھی تو بری سی بو آرہی تھی۔ اچھا تو نہیں لگا لیکن اس نے سوچا ان دنوں دس میں ایک دو ہی ایسے ہوتے ہیں جو یہ شوق نہیں کرتے۔ نہیں کیا۔

پھر ایک دن چاچی نے دیکھا کہ ایک عورت اس کے پیچھے پیچھے کمرے کی طرف جارہی ہے۔ تیز تیز چلتی ہوئی، گیٹ اور اس کے کمرے کے بیچ کے چوڑے راستے میں۔ اسے برا لگا لیکن کچھ بولی نہیں۔ سوچا جب چلی جائے گی تو پوچھوں گی لیکن ٹی وی کے سیریل میں جو وہ بڑے چاؤ سے دیکھتی تھی اس رات کچھ ایسا الٹا پلٹا ہوا کہ وہ بہت سی باتیں بھول گئی۔ ان میں اس عورت کی بات بھی تھی۔ پھر کئی دن بعد اس نے صبح صبح ایک عورت کو اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ معلوم نہیں وہی تھی یا کوئی دوسری۔ اب اسے سچ مچ بہت غصہ آیا اور اس نے پکا ارادہ کرلیا کہ پوچھے گی ضرور لیکن وہ جب بھی دکھائی پڑتا اور یہ تقریباً ہر دن ہوتا، وہ سر کو ذرا سا جھکا کر نمستے کرتا، ہنس کے اس کی طرف دیکھتا اور ''کوئی کام تو نہیں چاچی، سڑک پار تک (یا بازار یا کہیں اور) جارہا ہوں، کچھ چاہیے ہو تو لادوں'' کہتا اور وہ عورت کے بارے میں پوچھنے کا کام اگلے دن کے لیے اٹھا رکھتی۔

لیکن کچھ دنوں بعد اسے یاد بھی نہیں رہا کہ عورت کے بارے میں اس کا غصہ اور کرائے دار سے پوچھنے کا ارادہ ٹی وی سیریل کے ہیرو کے کیا سے کیا ہو جانے میں کہیں الجھ کر رہ گیا ہے یا دن بھر کے چھوٹے بڑے کاموں اور بابو جی کی بیماری میں۔ بھلا ایسے میں اسے یہ خیال کیسے آتا کہ اس سے پوچھنے کی بات کہیں کرائے کے پندرہ سو اور پانی بجلی کے دو سو روپوں میں تو الجھ کے نہیں رہ گئی ہے۔ اور اسے کچھ بھی تو یاد نہیں رہ گیا تھا، نہیں تو وہ شاید پتہ لگانے کی کوشش کرتی۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا کہ وہ آٹھ آٹھ دس دس دن کے لیے چلا جاتا۔ کبھی پوچھتی تو کہتا گاؤں چلا گیا تھا۔ ایک آدھ بار بتایا کہ کسی کام سے کانپور گیا تھا۔ جانے سچ

کہ جھوٹ۔ اس سے کیا وہ پوچھتی۔ کرایہ وقت پر دیتا ہے۔ کبھی آنا کانی نہیں کرتا۔ نہیں کیا ہوا اور تاریخ نکل جائے تو اُلٹے ہی دے دیتا ہے۔ ''اچھا کیجیے چاچی دیر ہو گئی'' ایک بار نہیں کئی کئی بار کہتا اور کبھی کئی دنوں کے لیے باہر جانا ہوتا تو پہلے ہی دے دیتا۔

گھنٹی کم ہی بجاتا ہے۔ پہلے دروازے پر دھپ دھپ کرتا ہے۔ کوئی جواب نہیں ملتا تو دھیرے سے پکارتا ہے، کبھی ''چاچی'' کبھی ''ماتا جی''۔ شاید طے نہیں کر پایا ہے کس نام سے پکارے، یا پھر بھول جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ وہ رسوئی میں، جو باہر کے دروازے سے ذرا دُور سرنگ کی طرح ہے، ہوتی ہے اور نہ یہ دھپ دھپ سنائی دیتی ہے نہ اس کی آواز پہنچتی ہے، تب گھنٹی بجاتا ہے لیکن ایسے جیسے بٹن پر ہاتھ دھوکے سے پڑ گیا ہو اور اس پر بھی کوئی جواب نہیں ملتا تب کہیں جا کر بٹن پر ذرا دیر تک انگلی رکھتا ہے۔ تب تو کھنچتی ہوئی تیز آواز پہنچ ہی جاتی ہے۔ چاہے جہاں بھی ہوں۔ ''کھولیے''۔

پٹر پٹر کرتی ہوئی جا کر دروازہ کھولتے کھولتے پوچھتی ''کون ہے؟'' تو وہ سامنے کھڑا ہوا نظر آتا۔ ہمیشہ کی طرح سر جھکائے ہوئے۔

''بولتا کیوں نہیں رے؟'' وہ ایسے پوچھتی جیسے ڈانٹ رہی ہو۔۔۔ جواب وہ تب بھی نہ دیتا۔ اسی وقت چاچی کی نظر اس کے ہاتھ پر پڑتی جس کے ایک انگلی میں تلی میں بندھی ہوئی چابی جھول رہی ہوتی۔

''ابھی ایک ہفتہ اُدھر تو آیا ہے، پھر چل دیا۔''

''جی ماتا جی'' وہ کہتا ''وہ ایسا ہے کہ چھٹی آئی ہے پھوپھا جی کی طبیعت خراب ہے۔''

''چٹھی تو تیری کئی دنوں سے آئی نہیں؟'' چاچی کہتی ہے۔

''وہ ماتا جی یہ ہے کہ چٹھی ایک دوست نے دی ہے۔'' وہ کچھ اس طرح منمناتا کہ سچی بات جھوٹی معلوم ہونے لگتی۔

''دو دو پتوں پر چٹھی منگاتا ہے؟'' وہ اسے چھیڑتی ہے۔ یا خود ہی مزا لیتی ہے۔

''وہ ماتا جی ایسا ہے کہ جہاں پہلے رہتا تھا وہاں آئی تھی۔ دوست نے لے لی تھی۔''

''کب لوٹے گا؟''

''دس دن میں ماتا جی'' وہ سر جھکائے جھکائے ہی بتاتا ہے۔

''مطلب یہ کہ پندرہ دن لگیں گے''۔

وہ کوئی جواب نہیں دیتا لیکن جیسے ہی دیکھتا کہ دروازہ اندر سے بند کرنے کے لیے چاچی ہاتھ بڑھا رہی ہے کمرے کی چابی آگے بڑھا دیتا۔

خطرہ کی پہلی گھنٹی اس دن بجی جب دو کانسٹبلوں نے آ کر پوچھا۔

''للّے یہیں رہتا ہے''

وہ یہ نام نہیں جانتی تھی۔ بلکہ سچ پوچھیے تو کوئی نام ٹھیک سے نہیں جانتی تھی۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی اس کی۔''بھیا'' ''ارے کہاں چلا''،اور''ذرا دیکھ تو لے کوئی آیا ہے'' یا اسی طرح کے کسی اور''نام'' سے کام چلا لیتی تھی،اس لیے اس نے کہہ دیا۔ ''للّے تو یہاں کوئی نہیں رہتا،'' لیکن جب انھوں نے شکل صورت اور ایک آدھ اور پہچان بتائی تو اس نے''ہاں'' کہہ دیا۔ چھپانے کی کوئی بات تھی بھی نہیں۔

وہ آیا تو اس نے بتا دیا۔ بولا

''سرور کو ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ جا کے بتا آؤں۔ میں نے اسے کئی مہینے سے دیکھا بھی نہیں''۔

''یہ سرور کون؟''

چاچی نے پوچھا اور اسے کچھ کچھ شک بھری آنکھوں سے دیکھا۔ پہلی بار۔

''پہلے میرا دوست ہوتا تھا۔ پھر پتہ لگا کہ گڑ بڑ ہے تو میں نے ملنا جلنا چھوڑ دیا'' اس نے بتایا، ایسے جیسے کوئی خاص بات نہ ہو اور ابھی آتا ہوں کہہ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں لوٹ بھی آیا۔ لیکن اور کچھ بتایا نہیں۔ چاچی نے پوچھا بھی نہیں۔

پھر ایک دن پولیس نے باقاعدہ چھاپا مارا۔ دونوں بکسوں کے کپڑے لتّے نکالے، جھاڑ جھاڑ کر انھیں دیکھا، گلاس کٹوریاں تک اٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکیں، معلوم

نہیں کیا ہوا کہ بھری بالٹی پیچھے کے آنگن میں لڑھکا دی۔

چاچی نے جو دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولے، دیکھ رہی تھی، آواز ذرا اونچی کر کے کہا ''بھیا پانی نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔''

بڑی بڑی مونچھوں والے سپاہی نے دیکھا تو ذرا سا گھور کر لیکن بولا کچھ نہیں، ایسا بن گیا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ یہ سلسلہ کوئی گھنٹے سوا گھنٹے چلتا رہا۔ پھر وہ ان کے ساتھ جانے لگا تو گیٹ سے ذرا پہلے رک کر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا، جیسے اسے معلوم ہو کہ چاچی وہاں ہوگی۔ اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ وہ بھلا وہاں کیسے نہ ہوتی؟ اسے دیکھتے ہی آگے کی طرف بڑھا۔ پہلے تو اس نے کمرے کی چابی دی، پھر جیب سے روپے نکال کر گنے۔ وہ روپے دیکھ نہیں رہی تھی لیکن نظر پڑ ہی گئی۔ ہزار ہزار روپے کے تین نوٹ تھے۔ تین چار پانچ پانچ سو کے اور تھوڑے سے سو سو کے، آٹھ دس رہے ہوں گے۔ پھر سارے بڑے نوٹ چاچی طرف بڑھاتے ہوئے بولا ''یہ تین مہینے کا ہے، سو کم ہیں۔ بعد میں دے دوں گا۔ یا ابھی دے دوں؟''

اس نے اپنے ہاتھ میں سو سو کے چار پانچ نوٹوں کی طرف دیکھا۔

وہ سناٹے میں آ گئی۔ کچھ بولتے نہ بنا لیکن ہمت پورے بدن سے بٹوری اور آہستہ سے کہا۔

''روپے کی ضرورت تجھے نہیں ہے، جو سارے روپے دیے جا رہا ہے؟ لے یہ روپے رکھ لے۔ جانے کس وقت کیسی ضرورت پڑ جائے۔۔۔ تیری جمع رقم تو ہے میرے پاس۔ ویسی کی ویسی رکھی ہوئی ہے''۔

''وہ ایسا ہے چاچی کہ روپے میرے پاس ہیں۔ اور وہاں روپوں کا کیا کروں گا۔ انھوں نے روک لیا'' اس نے سپاہیوں کی طرف آنکھیں تھوڑی سی موڑیں ''تو کھانے کو دیں گے ہی۔ ویسے اس کا ذمہ تو کسی اور نے لے رکھا ہے،'' اس نے رسان سے کہا، ہمیشہ کی طرح سر جھکائے جھکائے، آنکھیں ملائے بغیر۔

مونچھوں والا سپاہی افسر کی نظریں بچا کر اب مسکرا رہا تھا۔ چاچی نے سوچا کہ

تھوڑی دیر پہلے اس نے جس طرح بات کی تھی اس سے وہ اور دوسرے سپاہی چھونرم پڑ گئے تھے۔ اب ان کے چہروں پر تناؤ نہیں تھا اور پانچواں، وہ تو افسر تھا، بس حکم چلاتا رہا تھا۔ "جیبوں کی تلاشی لو، یہ کاغذ کیسے ہیں؟ ان پر کیا لکھا ہے۔ اس خط کا کونا پھٹا نہیں ہے۔ پھاڑا گیا ہے۔ کیا کہا میں نہیں جانتا کیسے پھٹا، کوئی بات نہیں، وہاں پوچھ لیں گے۔"

اس کے چہرے پر تناؤ پہلے بھی نہیں تھا۔ اور اب تو وہ ایک آدھ بار ہنس دیا تھا اور اسے ہنستا دیکھ کر باقی سپاہی ذرا کھل کر مسکرانے لگے تھے، یہ سوچے بغیر کہ صاحب دیکھ نہ لیں۔

لیکن وہ اسے لے گئے۔ باہر کی کمر کمر اونچی دیوار پر ذرا سا جھک کر چاچی نے سڑک پر دیکھا تو وہ سب باتیں کرتے جا رہے تھے۔ جس نے بھی دیکھا ہوگا، اس نے سوچا یہی سمجھا ہوگا کہ پولیس والے اس کے دوست ہیں۔ اس نے خود کو اطمینان دلایا۔ پھر بھی اندر، دل کے بالکل اندر، ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اسے کھرچ رہا ہے، کھرچے جا رہا ہے۔

وہ آیا نہیں۔ دو تین دن تک تو ایسا انتظار رہا کہ کہیں ذرا سی کھٹ ہوتی تو وہ سمجھتی کہ گیٹ اسی نے کھولا ہے۔

پھر پانچ چھ دن ہو گئے تو چاچی نے اپنے آپ کو سمجھا لیا۔ جاتا ہے تو پندرہ دن تو لگتا ہی ہے۔ اس نے سوچا پولیس والوں کے ساتھ گیا ہے تو کیا ہوا، کیا وہ اسے مار ڈالیں گے؟ ایسا بھی اندھیر نہیں ہے۔۔۔ تھوڑا سا اطمینان اور تھوڑی سی پریشانی اس کے دل میں ساتھ ساتھ آتے اور ایک ساتھ جیسے نکل جاتے۔ سینہ بھائیں بھائیں کرنے لگتا۔ لیکن مہینہ اوپر ہو گیا تو اندھیرا بڑھنے لگا۔ اس نے اندھیرے پر آخری رام بان مارا۔ بھگوان تو ہیں۔ کچھ دن اور نکل گئے۔

ایک دن شکلا جی کی نوکرانی نے جو دیکھنے آئی تھی کہ بجلی خالی اس کے مالک کے یہاں نہیں آ رہی ہے یا اور گھروں کا بھی یہی حال ہے، یہ جاننے کے بعد کہ رات ہوتی تو چاچی کے یہاں بھی اندھیرا پڑا ہوتا، لوٹتے سمے ایسے پوچھا جیسے ابھی ابھی خیال آیا ہو۔

''پیچھے کا کمرہ بند ہے۔ کیا کرائے دار خالی کر کے چلا گیا؟''

''نہیں۔ خالی نہیں ہے۔ وہ ہے۔ کہیں گیا ہوا ہے۔ کیوں کیا ہوا؟'' اس نے ایسے پوچھا جیسے اسے کچھ پتہ ہی نہ ہو۔

''کوئی بات نہیں چاچی۔ دو دن اُدھر ایک آدمی کمرے کے لیے پوچھ رہا تھا۔ میں برتن مانجھ رہی تھی، باہر بمبے پر۔ سو میں نے کہہ دیا پتہ لگا کر دو تین دن میں بتاؤں گی۔ شاید آج آئے۔ میں نے سوچا پتہ کر لوں'' یہ کہتی ہوئی وہ چلی گئی۔

نوکرانی کی ہوشیاری پر چاچی نے دل ہی دل میں ہنسنا چاہا لیکن ہنسی آئی نہیں۔ وہاں اس کے لوٹ کے نہ آنے کی پریشانی پہلے ہی سے بیٹھی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے آپ کو بہلایا۔ اس بار تھوڑے زیادہ دنوں کے لیے کہیں چلا گیا ہوگا۔ یہ بات آواز کے بغیر چاچی نے رک رک کر دہرائی لیکن یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ ایسا ہے نہیں، وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ کسی اور سے نہیں، اپنے آپ سے۔

پر جب دس بارہ دن اور نکل گئے تو جھوٹ موٹ کا یہ سہارا بھی اس کا ساتھ چھوڑنے لگا۔ ہوسکتا تھا کہ یہ دن کچھ اور کھنچ جاتے لیکن اب اسے لگتا کہ پاس پڑوس کے لوگوں کی آنکھیں ہر وقت اس کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہیں۔ خود اس کے بارے میں نہیں، للّے کے بارے میں۔ وہ خود اپنی آنکھوں میں چور بنتی جا رہی تھی۔

تھوڑے دنوں بعد طرح طرح کی باتیں اسے سنا کر کہی جانے لگیں۔ کہی جاتیں تو دوسروں سے لیکن اس طرح کہ وہ سن لے۔ کوئی کہتا جیب کترا تھا۔ پولیس والے ایسی ہی تھوڑی آئے تھے۔ چھاپہ پڑا تھا چھاپہ، مال بھی برآمد ہوا۔ جبھی تو پکڑ کر لے گئی تھی۔ کوئی اسے کچھا بنیائن گروہ سے جوڑ دیتا اور راجو کی اماں نے تو وہ کہہ دیا کہ کسی کے کہنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔ ''آنکھیں نہیں دیکھیں'' کیس لال لال تھیں۔ ایسی آنکھوں والوں کے لیے جان لینا کوئی بات نہیں ہوتی۔ میں نے تو سنا ہے سپاری لے کر لوگوں کو صاف کر دیتا تھا'' جتنے منہ اتنی باتیں بلکہ جتنے منہ اس کی دُگنی باتیں۔۔۔ پہلے اس طرح کی کوئی بات سنتی تو وہ ہنسنے کی کوشش کرتی تھی۔ اب یہ کوشش

بھی اس نے چھوڑ دی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ پھر اسے لگا کہ لوگوں نے ہار مان لی ہے۔ کئی دنوں سے اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ اس سے اسے تھوڑا سا اطمینان سا ہوا تھا۔

تبھی اطمینان کی ایک بات اور ہو گئی۔

بابو جی نے ایک دن کہا'' آج طبیعت بحال ہے۔ جی چاہتا ہے باہر نکل کے دس بیس قدم چل کے دیکھوں۔ بہت دن ہو گئے گھر سے باہر نکلے ہوئے۔ کھاٹ پکڑے کتنے دن ہو گئے۔''

''بھگوان نہ کرے تم کھاٹ پکڑو۔ روگ تو جی کے ساتھ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ایسا کرو، باہر تخت پر لیٹ رہو۔ میں بچھونا بچھا دیتی ہوں ۔ کھلا آسمان، ہرے بھرے درخت، لوگوں کو آتا جاتا دیکھو گے تو اچھا لگے گا۔'' یہ کہہ کر چاچی مڑی ہی تھی کہ اس نے آواز دے کر روک لیا۔

''تخت گھر کے اندر بھی بچھا ہے۔ میں ذرا سڑک پر چل کر دیکھنا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ کہیں جانا تھوڑی ہے۔ تین مہینے ہو گئے رکشہ ٹیمپو بھی نہیں دیکھا۔ بس نکو کے مکان تک جا کے لوٹ آؤں گا۔''

''چھنگو کی دوکان تک؟''

چاچی مسکرائی کم، شرمائی زیادہ۔

اس نے گھور کے دیکھا۔ لیکن اس میں شرارت بھی شامل تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ سچ مچ جی کر رہا ہو تو ہو آؤ باہر۔ لیکن کیول کچھ لینے جا رہے ہو تو بیکار تھکنے سے فائدہ۔ میں منگوا دوں گی۔'' اس نے کہا اور منہ ذرا سا پھیر کے دھیرے دھیرے ہنسنے لگی۔ اس وقت اس کی ہنسی میں شرارت ہی شرارت تھی۔

''میں سوچتا ہوں ہو ہی آؤں''

اس نے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انھیں کچھ کچھ برابر کیا۔ ہوائی سلیپر کونے میں رکھ کے باہر جانے والی چپل پہن لی اور ''ابھی آیا'' کہتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔

وہ دروازے کے پاس سے اسے دو تین مکان اُدھر تک دیکھتی رہی اور سوچتی

رہی کہ کتنے دن بعد ایسا ہوا ہے کہ من ہلکا لگتا ہو، جیسے اسے پکڑ نہ لیا تو ہوا کے ساتھ اوپر، اور اوپر اور اوپر اڑ کر ایک دم ناچنے لگے گا۔

اس وقت للّے کا خیال اس کے آس پاس بھی نہ تھا۔ لیکن دو تین ہی دن بعد تنو کی اماں نے وہ تار پھر چھیڑ دیا۔ ''چاچی، چاچی، ورماجی کو کہیں سے پتہ لگا ہے کہ للّے پہلے بھی ڈیل ہو چکی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم؟''

وہ چپ رہی۔ یہ بات وہ سچ مچ نہیں جانتی تھی۔ ہو سکتا ہے یہ بات سچ ہو۔ اس نے سوچا اور تنو کی اماں کی طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

''لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں'' تنو کی اماں نے ایک اور تیر مارا، یہ سوچ کر کہ یہ اپنے نشانے پر ضرور لگے گا لیکن جملہ پورا کرنے سے پہلے انھوں نے ادھر ادھر دیکھا اور جب پکّا ہو گیا کہ کوئی اور نہیں سن رہا ہے تو اپنی بات پوری کی، لیکن نئے سرے سے شروع کر کے ''لوگ کہتے ہیں للّے مسلمنٹا ہے۔''

چاچی کو یہ بات معلوم تھی لیکن بالکل اسی طرح جیسے سب جانتے ہیں کہ سڑک کے کنارے بڑے بڑے پیڑ لگے ہیں، پھر بھی ان کے بارے میں کوئی سوچتا نہیں جب تک اسے تھوڑی دیر کے لیے لو دھوپ سے بچنا نہ ہو یا ایک دم زوردار بارش نہ ہونے لگے --- یہ بات نہ اس نے بتائی تھی نہ میں نے پوچھی تھی، چاچی نے سوچا اور تنو کی اماں کی طرف کچھ اس طرح دیکھنے لگی جس سے وہ جو چاہے سمجھ لے! جانتی ہے، نہیں جانتی۔

لیکن خود وہ ایک بات جانتی تھی۔ یہ عورت پاس پڑوس کے ایک ایک گھر جا کے، اِدھر اُدھر دیکھ کے کہ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے، راز کی یہ بات کانوں میں انڈیل ضرور دے گی۔

اور اگلے دو تین دنوں میں ہوا بھی یہی تھا۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ للّے مسلمنٹا ہے اور اپنا نام چھپا کے سال بھر سے چاچی کے کمرے میں رہ رہا ہے۔

للّے کا خیال تو اس کے دماغ میں اس وقت بھی جھولتا رہتا تھا جب وہ سمجھتی تھی

کہ اسے بھولے ہوئے ہے لیکن ادھر ایک اور طرح بھی وہ اس کے بارے میں سوچتی.
تین مہینے کے ایڈوانس کرایے کی بات اس نے اس ڈر سے ایک آدھ بار کہہ دی تھی کہ
لوگ نئے کرائے دار لے کر نہ آنے لگیں لیکن جمع رقم کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں تھا
اور اب تین مہینے پورے ہونے کو تھے۔ اس کے بعد کوئی نیا کرائے دار آ گیا اور وہ بھی
کالونی کے کسی جاننے والے کو اپنے ساتھ لے کر، تو وہ کیا بہانہ کرے گی اور شاید دل کے
کسی کونے میں یہ خیال بھی تھا کہ جانے اب جو آئے وہ سترہ سو دے کہ نہ دے۔

لیکن یہ خوف ابھی پریشانی نہیں بنا تھا۔ سات آٹھ دن تو باقی تھے ہی۔

دھیرے سے کسی نے دروازہ تھپتھپایا۔ آواز کچھ پہچانی پہچانی سی لگی لیکن اس نے
اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچا اور کہا ''کون ہے رے''۔ اور پھر تخت سے اٹھ کر دھیرے
دھیرے باہر کے کمرے کی طرف بڑھی، پھر دروازہ کھولا اور اونچی آواز میں بولی۔

''ارے تو!''

للّے سامنے کھڑا تھا۔ سر جھکائے ہوئے، ہمیشہ کی طرح۔ ایک تھیلا ہاتھ میں
تھا، دوسرا جو ذرا بھاری معلوم ہوتا تھا، اس نے فرش پر رکھ دیا تھا۔ پاس ہی میں ایک پوٹلی
تھی۔ اس میں شاید آٹا تھا۔

چاچی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا پوچھے، کیا نہ پوچھے۔ پہلی چیز جو اس نے
سوچی وہ تھی کہ اب کسی نے پوچھا تو کہہ سکوں گی کہ کمرا خالی نہیں ہے، وہ آ گیا ہے۔
بلکہ نہ بھی کسی نے پوچھا تو بھی ایک ایک کو بتاؤں گی۔ اس کا جی چاہا کہ اتنے دنوں کی
ساری دبدھا ایک دم انڈیل دے لیکن جملہ جو اس کے منہ سے نکلا وہ سیدھا سادا تھا۔

''بہت دن لگا دیے، کہاں گھومتا پھرتا رہا؟''

''کہیں نہیں چاچی، کانپور چلا گیا تھا، وہاں ایک آدمی کے پاس بیس ہزار
روپے تھے۔ اسی کے یہاں تھا۔''

''تو اب کانپور اتنی دور ہو گیا'' اس نے کہا، پھر سوچا یہ اس کی بات کا جواب

نہیں تھا اور پوچھا ''تو روپے مل گئے؟''

پوچھنے کو تو اس نے یہ بات پوچھ لی لیکن یہ بھی سوچنے لگی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں ایڈوانس کے لیے یہ بات پوچھ رہی ہوں پھر بھی وہ پریشان نہیں ہوئی۔ سچ پوچھیے تو اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ اتنی بہت سی چیزیں دماغ میں گھسی جا رہی تھیں، بہت تیزی سے، کہ کوئی بھی ٹک نہ پاتی تھی۔

وہ دیکھ بھی تو سب کچھ جلدی جلدی رہی تھی۔۔۔۔ کپڑے صاف ستھرے اور اچھے پہنے تھا، جوتا بھی چمک رہا تھا اور بدن پر تھوڑا سا ماس بھی چڑھ گیا تھا۔ خوشیوں نے بھی جیسے ایک دم دھاوا بول دیا تھا۔ اس کے صحیح سلامت لوٹ آنے کی خوشی اور سب سے زیادہ اس کی کہ اب وہ ان سے، جو طرح طرح کی باتیں کرتے تھے، کہہ سکے گی ''یہ ہے للّے، وہ لوٹ آیا ہے، تم لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے۔ دیکھو اسے! جیل سے کوئی ایسا چکنا چپڑا ہو کے نکلتا ہے؟'' اسی وقت اسے ایک اور خیال آیا اور یہ ایسا تھا کہ اسے نہال کر گیا۔ ان خوشیوں میں کرائے دار للّے کی واپسی کی خوشی کہیں نہیں تھی۔ چاچی اس خوشی میں نہا گئی۔ پور پور بھیگا، پھر سوکھا، پھر بھیگا، پھر سوکھا اور اس بھیگنے سوکھنے میں وہ شرما گئی۔

''کب تک کھڑا رہے گا۔ جا اپنے کمرے میں۔ اُلٹا پلٹا پڑا ہوگا سب۔''

اسی وقت اسے خیال آیا کہ کھڑا وہ شاید اس لیے ہے کہ چابی تو میرے پاس ہے۔ ماتھے پر دھیرے سے ہاتھ مار کے بولی ''میری تو مت ماری گئی ہے، اتنی دیر سے تجھے کھڑے رکھے ہوں۔ ابھی چابی لائی'' کہتے ہوئے وہ گھر کے اندر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد پیچھے کے آنگن کی طرف کے دروازے پر تھپ تھپ ہوئی۔

چاچی لپکی۔

وہ سامنے کھڑا تھا۔ کرتا پیجامہ پہنے اور سَو سَو کے نوٹوں کی گڈی ہاتھ میں لیے۔

چاچی نے روپے لیے لیکن منہ ایسا بنایا جیسے للّے اسے کوئی بہت خراب چیز

دے رہا ہو۔ پھر سے خیال آیا کہ شاید دل کی بات اس تک نہ پہنچی ہو، اور پوری طرح وہ دل کی تھی بھی نہیں۔ اس لیے اس نے لفظوں میں کہہ دی۔

''جب آیا اسی وقت کیوں نہیں دے دیے تھے۔ اتنی دیر کرنے کی کیا ضرورت تھی'' وہ ہنسی ''سچ بتا، روپے تجھے کاٹتے ہیں۔ باہر بھی لٹاتا ہوگا۔ جانتا ہے ایک ایک پیسہ کیسی مشکل سے کمایا جاتا ہے''

اس نے سر ذرا سا اوپر نیچے کیا 'جانتا ہوں چاچی۔۔۔ یہ روپے بڑی محنت کے کمائے ہوئے ہیں۔ پہلے کے ہیں۔ بچا کے رکھے تھے۔ اپنے ایک دوست کے پاس۔۔۔ اب کہیں سے کچھ اور نہیں ملنا ہے''۔

''تو۔۔۔ آگے کیا کرے گا؟''

''آگے؟۔۔۔ محنت کروں گا۔۔۔ کماؤں گا، جیسے اس لپھڑے میں پھنسنے سے پہلے کماتا تھا''

''لپھڑے'' ایسا لفظ چاچی نے اس کے منہ سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ اتنے دنوں میں بدل تو نہیں گیا۔ اس نے سوچا۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔

وہ سمجھا بات ختم ہوگئی ہے۔ اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ اس نے مڑتے ہوئے کہا۔

''سو روپے باقی کے بھی ہیں۔''

''جانتی ہوں، جانتی ہوں۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا'' وہ مسکرائی، پھر بولی ''لیکن اس سے کام نہیں چلتا۔ میری سن، ذرا رسان سے''

اس نے چاچی کی طرف مڑتے ہوئے چپکے سے آنکھیں اوپر کیں، جیسے چوری کر رہا ہو۔

''میں کہتی ہوں رسان سے سن، تھوڑی دیر ناک پر مکھی بیٹھی رہنے دے۔ تین مہینے کے تو نے ابھی دیے ہیں، میرے پاس تھوڑے سے پہلے کے بچائے ہوئے بھی ہیں۔ اب تو' میری فکر نہ کرنا۔ اپنے سارے روپے کام میں لگا دے۔ چاہیئے ہوں تو یہ بھی لے لے۔''

وہ اپنی جگہ جم کے کھڑا ہو گیا۔ جیسے کوئی لمبی بات سننے کے لیے تیار ہو۔ اس نے چاچی کو آنکھ ملا کے دیکھا۔ لگتا تھا اس نے ایسی میٹھی بات بہت دنوں سے نہ سنی ہو۔ پھر ذرا سا آگے بڑھا، چاچی کا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ لے لیا۔۔۔ ایک ہاتھ سے اسے دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ پھر کہا۔

''ماں!''

چاچی کے لیے یہ بات بالکل نئی تھی، ایسی جو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ اچھا ہے، یہ وہ جانتی تھی لیکن اتنا اچھا ہے، یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے یاد نہیں آیا کہ اس کے کسی چھوٹے نے اس کے ہاتھ کو کبھی اتنے پیار سے چھوا ہو۔ اس کا جی چاہا کہ وہ رو دے۔ لیکن وہ روئی نہیں، وہ جانتی تھی کہ اس کی آنکھ سے ایک بھی آنسو ٹپکا تو وہ پھوٹ پڑے گا۔ اُس نے دھیرے دھیرے پلکیں اٹھائیں۔ للّے کا چہرہ سُتا ہوا تھا، ہلکا نیلا، کچھ کچھ کالا، جیسے کانسے کا بنا ہو پھر بھی اس میں وہ بھولا پن تھا جو اسے اچھا لگتا تھا اور جسے دیکھنے کے لیے وہ اس کی نظریں چرا کر کبھی کبھی اس کی طرف دیکھ لیا کرتی تھی۔

اس نے دھیرے دھیرے چاچی کا ہاتھ چھوڑا، اتنے دھیرے دھیرے کہ اس میں کئی منٹ لگ گئے۔۔۔ کئی منٹ اور لگ گئے تب کہیں وہ چاچی کا ہاتھ چھوڑ پایا۔

پھر دونوں لوٹ گئے۔

وہ جانتا تھا کہ اندر جا کر چاچی روئے گی۔ کچھ ایسی ہی بات شاید چاچی نے بھی سوچی تھی۔

اندر کے کمرے سے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ ایک بار، دو بار، تین بار۔ کھانسی تھی کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' کہتے ہوئے وہ تیزی سے لپکی۔ بابو جی کھانستے کھانستے تنگ آ کر پلنگ پر بیٹھ گئے تھے۔ سر آگے کو جھک آیا تھا۔ وہ کھانستے تو کھادی کی بنیائن کے

نیچے سے پسلیاں دھونکنی کی طرح پھولتی، سمٹی دکھائی پڑتیں ۔۔۔۔ تیزی سے باہر کو نکلی ہوئیں، پانی لے کر لوٹی اور اسٹیل کا گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔

''ایک ایک گھونٹ کر کے،'' اس نے کہا، ''جلدی نہ کرو، اُچھو ہو گیا تو پھر کھانسنے لگو گے۔''

کھانسی تھم گئی تو اس نے انھیں ہاتھوں کا سہارا دے کر دھیرے دھیرے لٹا دیا۔ تکیہ جو ایک طرف کھسک گیا تھا برابر کرنے لگی تو اس کے نیچے سے دو بیڑیاں، جو بنڈل کی شاید آخری تھیں، اور دیا سلائی پر نظر پڑی۔ چپکے سے ہنسی، اس سے چھپا کے، اور جھوٹ موٹ کے غصّے سے بولی۔

''میری کبھی مانی ہے جو اَب مانو گے ۔۔۔۔۔ میں جانتی ہوں یہ کیسے آئی ہے ۔۔۔۔ شیلندر موسا کا پوتا کبھی کبھی انگریزی کے دو اکشر پڑھنے آتا ہے، اسی سے منگاتے ہو۔ اپنے جی کا خیال نہیں کرتے۔

وہ مسکرایا۔

''اور اوپر سے ہنستے ہو ۔۔۔۔ یہ نہیں سوچتے کہ اچھے ہو جاؤ گے تو ایک دو بچّوں کا ٹیوشن کر کے دو پیسے کما لو گے، گھر کے دس کام نکلیں گے''

یہ سن کے بھی وہ مسکرایا تو اس کی ممتا آہستہ آہستہ جاگ پڑی اور وہ اس کے ماتھے پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس کی اُنگلیاں گھنے بالوں میں اُلجھ کر کنگھا کرنے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ٹٹول کر تکیے کے نیچے سے دونوں بیڑیاں نکالیں، ماچس کی ڈبیا بھی، اور دونوں چیزیں اس کی طرف بڑھا دیں۔

''لے، انھیں پھینک دے''۔

وہ ہنسی 'دبلی کی توبا ۔۔۔۔ کتنے دن کی ہے''۔

اب اس نے آنکھیں چھت کی طرف سے آہستہ آہستہ ہٹا کر اس کے چہرے پر گڑو دیں۔ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا، ایسا لگا جیسے بہت کچھ ٹوٹ کے بکھر گیا ہو، بولا۔

''تھوڑا اپنا بھی کھیال کیا کرو پولو کی اماں۔ کیا حال کر رکھا ہے تو نے اپنا۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، لیکن بالوں میں اُلجھی ہوئی اس کی اُنگلیاں ڈھیلی پڑنے لگیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اندر اندر رونا شروع ہو گیا ہے۔ اس وقت اس کا ایک بھی بول غضب ڈھا سکتا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ذرا سی دیر میں وہ اُنگلیاں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے گھنے بالوں کی رکاوٹوں کو روندتی ہوئی ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھیں اب ایک جگہ ٹکی ہوئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا جیسے بے جان، سوکھی اور سخت ٹہنیاں تیز ہوا کے جھونکوں میں اپنی ہی طرح کی سوکھی، کانٹے دار جھاڑیوں میں اُلجھ گئی ہوں۔

چاچی نے اپنی اُنگلیوں کو جن پر وقت نے ہلکی ہلکی لکیریں ڈال دی تھیں، بالوں سے آزاد کیا اور اُٹھتے ہوئے لمبی سی سانس لے کر بولی۔

''کتی بار کہا، پولو کی لماں مت کہا کرو'' اور باہر نکل گئی۔

وہ پاٹوں پاٹ کھلے ہوئے دروازے سے اُسے دیکھتا رہا اور جب وہ سیدھے ہاتھ کے کمرے کی طرف مڑی تو اس نے اپنے آپ کو پیچھے پیچھے جانے اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر، ایک لفظ بھی بولے بغیر، پھوٹ پھوٹ کر رونے سے بڑی مشکل سے روکا۔ اب اس کے ہونٹ ہل تو رہے تھے لیکن منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ بس اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

اب وہ بکسا کھولے گی، پلاسٹک کی تھیلی نکالے گی، اس میں کاغذ کی کئی پرتوں میں تہ کی ہوئی پولو کی تصویر نکالے گی اور اسے اس سمے تک دیکھتی رہے گی جب تک، آنکھوں کا ایک ایک آنسو سوکھ نہیں جائے گا۔ پھر اُسے اُسی طرح کاغذ کی پرتوں میں رکھے گی، دھیرے دھیرے۔۔۔ اس میں بہت سمے لگ جائے گا۔ کاغذ میں تصویر لپیٹے گی، پھر لپیٹے گی، پھر کھولے گی، پھر لپیٹے گی۔۔۔ بار بار یہی کرے گی۔۔۔ پھر آنکھیں بند کر کے بھگوان کی مورتی کے سامنے کھڑی ہو جائے گی''۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔۔۔ آنکھوں کے کونوں پر ہلکا سا بوجھ محسوس ہوا۔ اس نے سوچا چھو کر دیکھے کیا ہے۔ لیکن پہچان لیا اور انھیں پونچھا نہیں۔ بس کروٹ لے لی اور ایک ہاتھ سے تکیہ ذرا اوپر سرکا دیا۔ آنسوؤں کو گالوں پر دھیرے

دھیرے بہہ کر بستر میں جذب ہونے دیا۔۔۔ان پر لیٹوں گا تو بدن کو ٹھنڈک ملے گی۔ اس نے سوچا اور پھر بند آنکھوں کی پرچھائیوں کی طرح جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ اسے خود بھی پتہ نہ تھا کہ ذرا کی ذرا میں ایک پرچھائیں دوسری پرچھائیں کا روپ کیسے دھار لیتی ہے اور پھر تیسری کا، پھر چوتھی کا۔۔۔ ہر پرچھائیں جب آتی ہے تو لگتا ہے سدا کے لیے آئی ہے اور جب جاتی تو اپنا کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتی۔ سب کچھ کتنی جلدی بگڑ جاتا ہے اور جب بننے پر آتا ہے تو اس میں بھی دیر نہیں لگتی۔

چاچی کے یہاں اس وقت بننے کی باری تھی۔۔۔ للّے لوٹ آیا تھا، اس نے ایک نہیں تین مہینے کا ایڈوانس کرایہ دے دیا تھا، کالونی کے آس پاس کے مکانوں میں سب کی زبانوں پر تالے پڑ گئے تھے۔ اسی لیے وہ کچھ زیادہ ڈر رہی تھی۔

ایک دن جب وہ خالی بیٹھی ہوئی تھی، کچھ بھی نہیں کر رہی تھی اور کچھ کیے بنا یوں ہی بیٹھے رہنا اُسے ٹی۔وی تک دیکھنے سے اچھا لگ رہا تھا، جانے کیسے اُسے خیال آیا کہ اب للّے کے یہاں اس کے دوست یار نہیں آتے، وہ خود بھی کہیں آتا جاتا نہیں اور جانے کی ایسی ہی ضرورت پڑ جائے تو گھنٹے دو گھنٹے میں لوٹ آتا ہے۔ کبھی کبھی ایک چھوٹا سا جھولا اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے جسے لپیٹ کر وہ ہاتھ میں دبا لیتا ہے، لیکن جب لوٹ کے آتا ہے تو چھوٹی موٹی چیزوں کے وزن سے جھولا کبھی ایک طرف کو جھکا ہوا لگتا ہے، کبھی دوسری طرف کو۔

اس میں کوئی بڑی بات نہیں تھی، یہ سب اُسے ایسے یاد آ رہا تھا جیسے آنکھوں کے سامنے کوئی سفید پردہ ٹنگا ہو اور اس پر طرح طرح کی پرچھائیاں ایک کے بعد ایک آ رہی ہوں۔ یہ ساری پرچھائیاں ایسی تھیں کہ اس کا دل اور ہلکا ہوتا جا رہا تھا۔ اندر سے وہ اتنی خوش تھی کہ اگر اس عورت کی پرچھائیں بھی آ جاتی جو ہر جگہ الٹی سیدھی باتیں کہتی تھی اور جسے دیکھ کر اسے بہت غصہ آیا تھا تو وہ اسے بھی ''ہونہہ'' کہہ کر جھٹک دیتی۔

اگلے دن اُسے ایسا لگا جیسے کمرے سے کچھ کھٹ پٹ کی آواز آ رہی ہو۔ اس

نے ٹیلی وژن بند کیا اور کان لگا کے سننے لگی۔ یوں ہی، بس یہ جاننے کے لیے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ جاسوسی کرنے کی کوئی بات نہیں تھی اس میں۔

اسے لگا جیسے کسی سخت چیز میں کیل ٹھونکی جا رہی ہو۔ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی اسے یہ اچھا لگا۔ اپنا کام شروع کر دیا اس نے، من ہی من میں اس نے سوچا اور چوکی پر لیٹ گئی۔ ذرا ستانے کے لیے، صبح سے چوکا باسن کرتے کرتے تھک گئی تھی، آنکھ لگ گئی۔

ابھی جھپکی نے پہلی پینگ ہی لی تھی کہ پیچھے کے دروازے پر ہلکی سی تھپ تھپ ہوئی۔

اس کی ٹانگ دوسری ٹانگ پر سے نیچے لڑھک گئی۔ جاگ گئی۔

وہی ہوگا۔ اس نے سوچا اور اُٹھتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے۔ کچھ چاہیے کیا؟''

''ہتھوڑی ہوگی چاچی؟''

''ہے کیوں نہیں۔۔۔ پر تیرے پاس بھی تو ہے، ہر وقت کھٹ کھٹ کیا کرتا ہے۔''

''ہاں چاچی ہے'' وہ ہنسا ''لیکن چھوٹی ہے، مجھے اسی کی ضرورت پڑتی ہے''۔

''ذرا رُک۔۔۔ دیتی ہوں''۔

ہتھوڑی لے کر آئی تو اس نے دیکھا۔ نیم پلیٹ اور ذرا بڑی کیلیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔

''اس کا کیا کرے گا؟''

''اسی کو تو لگانا ہے۔ لوگوں کو بتانا بھی تو ہوگا کہ یہاں بجلی کے سامان کی مرمت ہوتی ہے''۔

''نیم پلیٹ۔ اس کے لیے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ نہیں ہوگا۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ بس ہمیشہ کی طرح سر جھکائے کھڑا رہا۔ دو ڈھائی منٹ۔ پھر بہت سی ہمت بٹور کر بولا ''اس کی تو کوئی بات ہی نہیں،

بھی چاچی۔''

چاچی بھی سن پٹائی ہوئی تھی۔ لیکن کچھ تو کہنا تھا۔

''تو بھول گئی ہوں گی۔۔۔لیکن نیم پلیٹ کیسے لگے گی؟''

اس نے کچھ جواب نہیں دیا''۔ کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔

دو منٹ کھڑے رہنے کے بعد اس نے بھی دروازہ بند کر دیا۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو تخت پر بیٹھ گئی، کچھ اچھا نہیں لگا تو پھر سے لیٹ گئی۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پنکھے کے پر گننے کی کوشش کرنے لگی۔ جانتی تھی کہ تین ہیں لیکن کچھ تو ہونا چاہیے کرنے کے لیے۔ پھر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد اُٹھی اور پنکھا تیز کر دیا۔ اس سے بھی کام نہ چلا تو ٹی وی کھول کے بیٹھ گئی اور چینل پر چینل بدلنے لگی۔ اس سے بھی اوب گئی۔ اب کیا کرے۔ بھوک بھی تو نہیں لگ رہی ہے۔ سوچتی رہی، سوچتی رہی، پھر رسوئی میں چلی گئی۔ وہاں سے نکلی تو فرج سے کچھ نکالتے نکالتے ذرا دوسری طرف منہ کر کے بولی۔

''ہاتھ تم اٹھ کر دھوؤ گے یا میں دھلا دوں''۔

کوئی جواب نہیں ملا۔

کھانا کھاتے کھاتے بابو جی نے پوچھا ''للّے نے ایڈوانس کے روپے دے دیے؟''

''ایڈوانس کے روپے!'' وہ ہنسی ''وہ تو اسی دن دے دیے تھے جب آیا تھا اور وہ بھی تین مہینے کے''۔

''کیا ہوا تھا۔ کچھ بتایا نہیں، پوچھا تھا؟''

''ہاں''۔ بتایا تھا۔ کہتا تھا انھیں بھی تو دکھانا ہوتا ہے کہ کچھ کام کرتے ہیں۔ اُسی دن شام کو اس سے کہہ دیا تھا جاؤ۔ اب ضرورت نہیں۔''

''اتنے دن کہاں لگا دیے اس نے؟ اسی دن لوٹ آتا تو طرح طرح کی باتیں نہ ہوتیں۔''

''کہتا ہے روپوں کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ روپے ہیں بھی اس کے پاس۔ اب اپنا کام شروع کرنا چاہتا ہے۔''

''اپنا کام؟'' انھوں نے اتنی حیرت سے اونچی آواز میں کہا کہ حلق میں نوالہ پھنس گیا۔ چاچی نے جھٹ سے پانی کا گلاس منہ سے لگا دیا۔ نوالہ نیچے اترا تو انھوں نے سینی کھسکا دی۔ اور دھلانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ نیم پلیٹ کے بارے میں کچھ پوچھے بابو جی سے۔

وہ بیمار نہ ہوتے تو اسے کسی کے کہنے سننے کی فکر نہ ہوتی۔

اس دن وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی کیا کرے، کیا نہ کرے، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

اگلے دن جیسے ہی اسے کنڈے میں تالا لٹکا کر باہر جاتے دیکھا تو پوچھا۔

''کیا خفا ہے رے؟''

وہ ہنسا۔ ''کیوں کیا ہوا؟''

''اچھا اسے چھوڑ، بتا کیا نام لکھے گا نیم پلیٹ پر۔۔۔۔ للّے۔''

وہ پھر ہنسا، سر نیچے کیے کیے۔ ''چاچی یہ تو گھر کا نام ہے۔۔''

''میں کیا جانوں، تو نے بتایا ہی نہیں''۔

اس نے پورا نام بتایا۔

یہ تو بہت صاف ہے۔ اس نے سوچا۔ اسی وقت اسے ایک ترکیب سوجھی اور اس نے کہا۔

''تو کوئی دوسرا نام نہیں لکھ سکتا۔ جسے کام کرانا ہوگا وہ آئے گا ہی''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش کھڑا رہا۔ ہلے ڈلے بغیر۔ پھر بولا

''یہ کیسے ہوگا چاچی۔۔۔ میں اپنا نام کیوں چھپاؤں۔''

یہ پہلی بار تھا کہ اس نے چاچی کی کوئی بات ماننے سے انکار کیا تھا، صاف صاف نہیں، گھما پھرا کر۔

وہ بھی کیا کہتی۔ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اسے دیکھتی رہی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بولا ''تو میں دوسرا کمرہ ڈھونڈ لوں چاچی؟''

اس کا بھی اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ گم سم کھڑی رہی۔ وہ باہر جانے کے لیے مڑنے لگا تو اس نے کہا ''للّے ابھی کمرہ نہ ڈھونڈنا، میں پوچھ کے بتاؤں گی۔''

یہ بات تو بالکل نئی تھی۔ اب تک تو وہ سارے فیصلے خود کرتی رہی ہے۔ اس نے سوچا۔ کس سے پوچھے گی؟ پتی دیو سے۔ وہ کہیں گے جیسا تجھے اچھا لگے۔ پاس پڑوس کے لوگوں سے؟ تب تو کمرہ ڈھونڈھنا ہی چاہیے۔ اسے چاچی کی حالت پر بڑا دکھ ہوا۔ کیا کرے بے چاری؟ دو ایک بیٹے ہوتے، ایک ہی ہوتا، میاں بیمار نہ ہوتا۔ پیسے ہوتے، دو چار آگے پیچھے پھرنے والے ہوتے تو اتنی لاچار نہ ہوتی۔۔۔ وہ اس کی حالت جانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مگر مچھ سے بیر نہیں مول لے سکتی۔

دونوں ایک ساتھ مڑے، آنکھیں ملائے بغیر۔ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے سے خفا نہیں تھا۔ ہاں دکھی ضرور تھے دونوں اور یہ دکھ انھوں نے ایک دوسرے کو دیے تھے، اپنی محبت سے، اپنی مجبوری سے۔

برائی تو اچھائی سے اکثر ٹکراتی ہے اور اچھائی برائی سے بھی، لیکن اچھائی اچھائی سے ٹکرا جائے، ٹکرا نہ جائے تو الگ، الگ راستے پکڑ لے تو کیا ہوگا؟ اُن کے بیچ یہ شاید پہلی بار ہوا تھا اور دونوں کو ہی دکھی کر گیا تھا۔

پانچ چھے دن بعد محمد لطیف نے ''دو رکشوں میں اپنا سامان لادا اور کمرہ خالی کر دیا۔

چاچی خاموش کھڑی تھی، چہرہ پیلا ہو رہا تھا اور جب وہ پیر چھونے اور اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے اس کے آگے جھکنے لگا تو چاچی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''نہیں للّے۔۔۔ نہیں!''

اس نے روکا لیکن للّے نے اس کے پیر چھو ہی لیے۔

''للّے!''

وہ کچھ نہ بولا

''بیٹے!''

''ماں!''

وہ مڑی، اندر جانے کے لیے۔ وہ سمجھ گیا۔ ''نہیں چاچی نہیں، میں جا تھوڑی رہا ہوں۔ آتا رہوں گا۔ تم سے ملنے۔ اپنے پاس رہنے دے۔ جب ضرورت پڑے گی لے لوں گا۔۔۔ اب جانے دے۔'' اُس نے چاچی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ سر جھکائے جھکائے موٹر سائیکل گیٹ سے باہر کی۔ کنکھیوں سے ایک بار اس کی طرف دیکھا۔

رکشے روانہ ہوگئے۔ وہ ان کے ساتھ تھا۔ دھیرے دھیرے موٹر سائیکل چلاتا ہوا۔

چاچی دھیرے دھیرے چل کر گیٹ تک آئی، آہستہ سے اُسے کھولا، دو قدم آگے بڑھی اور چھوٹے سے قافلے کو دیکھتی رہی، دیکھتی رہی، جب تک وہ سڑک پر بائیں طرف مڑ نہ گیا۔

دروازہ بند کر کے چاچی سیدھے ہاتھ کے کمرے میں گھس گئی، بکس کھولا، تہہ در تہہ کاغذ میں لپٹی ہوئی تصویر نکالی۔ دیکھتی رہی، پھر بولی۔

''تو نے للے کے آنے کا انتظار کیا، نہ اس کے جانے کا۔ وہ اپنی خوشی سے نہیں گیا ہے۔۔۔ تجھے کیا مجبوری تھی جانے کی!''

پاس کی دیوار پر ہاتھ پڑ گیا، سنبھالا مل گیا، گرتے گرتے بچی۔ اسٹول پر بیٹھ گئی۔ جانے کب تک بیٹھی رہی۔

■ ■

دار
و
رَسن
کی
آزمائش

دوسری سانس

مئی ۱۹۴۷ء کا آخری اتوار۔

نویں درجے کا امتحان دے کر میں لکھنؤ آ گیا تھا۔ اورئی کے مقابلے میں، جہاں میں رہتا تھا، یہ شہر بہت بڑا اور خوبصورت تھا۔ میں چوڑی چوڑی سڑکوں، بجی سجائی دوکانوں اور زرق برق کپڑے پہنے ہوئے مردوں اور عورتوں کو حیرت سے دیکھا کرتا۔ اور ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے، کبھی کبھی لوگوں سے ٹکرا بھی جاتا۔ ایک بار ایک صاحب نے بڑا بھلا بھی کہا تھا۔

میرے ایک ماموں حضرت گنج سے ذرا آگے نربی کے یونیورسٹی ڈیلی گیسی سینٹر میں رہتے تھے، جہاں ہفتے میں ایک دو بار جانا ہوتا تھا۔ اس دن وہاں سے یحییٰ گنج کے قاضی باغ، جہاں ایک دوسرے ماموں کے یہاں میرا قیام تھا، واپس جانے کے لیے مجھے اُٹھنی ملی تھی، جو ضرورت سے کہیں زیادہ تھی۔

نربی سے نکل کر حضرت گنج میں داخل ہوتے وقت کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میں نے دوسری بار اُٹھنی کی موجودگی کا احساس کیا۔ اُسی وقت میری نظر

الہ آباد بینک کے سامنے جہاں تانگہ اسٹینڈ تھا اور گھوڑوں کی پیاس بجھانے کے لیے پتھر کی ایک چرہی بنی ہوئی تھی، بیس پچیس لوگوں کی بھیڑ پر پڑی جو ایک دائرہ کی شکل میں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی تماشہ ہورہا ہو۔ قدم خود بخود اُس جانب بڑھنے لگے۔

وہاں پہنچ کر میں نے وہ دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایک شخص، جس کے دونوں شانوں پر ایک ڈوری سے بندھے ہوئے بہت سے چاقو لٹک رہے تھے۔ ایک پہیے پر جو پیروں سے کوئی کھٹکا دباتے ہی تیز تیز گھومنے لگتا تھا، چاقوؤں پر دھار رکھ رہا تھا۔ پہیہ تیز گھومتا اور چاقو اُسے چھوتا تو چنگاریاں نکلتیں۔

تین چار چاقوؤں پر دھار رکھنے کے بعد اُس نے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور انہیں سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر لوگوں کو دکھانے لگا۔ کوئی ہاتھ میں لے کر دیکھنا چاہتا تو بھی اُسے کوئی اعتراض نہ ہوتا اور چاقو وہ اُسے دے بھی دیتا۔ سورج کی روشنی کسی چاقو کے پھل پر پڑتی تو ذرا سی دیر کے لیے شعلہ سا لپک جاتا۔ وہ میرے پاس سے گزرا تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اٹھنّی ایک بار پھر ٹٹولی۔

اُس وقت اُس کے ہاتھ میں جو چاقو تھا ویسا خوبصورت چاقو اور اُس کا جگ مگ کرتا پھل میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس پر میرا دل ریجھ گیا۔ میں نے کچھ سوچے بغیر ہاتھ بڑھایا تو اُس نے چاقو مجھے دے دیا لیکن مشکل سے منٹ دو منٹ میں ''دیکھ لیا، جی بھر گیا نا'' کہتے ہوئے میرے ہاتھ سے لے بھی لیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت قیمتی چیز میرے ہاتھوں سے چھین لی گئی ہو۔

''حضرات، مہربان! آپ نے چاقو دیکھے، کیسے ہیں؟ اُس نے پہیے کے پاس پہنچنے کے بعد کہا

''اچھے ہیں'' کچھ لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔

''ایسے نہیں۔ میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔ زور سے کہیے۔ میں بھی تو سنوں!''

''اچھے ہیں'' بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔

''ہاں یہ ہوئی کوئی بات'' اُس نے کہا اور کھٹکا دبانے سے آپ ہی آپ کھل جانے والا چاقو ہاتھ میں لیا۔ کھٹکا دبا کر اسے کھولا۔

''ہے کوئی اس کا خریدار۔۔۔؟ دوکان پر دس سے کم میں نہیں ملے گا۔ لیکن میں صرف پانچ روپے میں دے دوں گا؟''

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں ابھری۔

''کیوں پانچ روپے کیا زیادہ ہیں؟ اچھا آپ ہی بتائیے کتنے میں لیں گے؟''

اُس نے کہا۔

''ایک روپیہ!'' کونے سے ایک دھیمی سی آواز سنائی دی۔

''کیا کہا، ایک روپیہ! اچھا کیا یہ بات تم نے دھیرے سے کہی۔ چاقو کہیں سُن لیتا تو شرم سے اس کی آب ماری جاتی''۔

''سوا روپیہ''۔ دوسرے کونے سے کسی نے بولی لگائی۔

''سوا روپیہ'' وہ ہنسا۔ ''اتنے میں تو آلو کاٹنے والی چھری بھی نہیں ملے گی''

کسی نے ایک آنے زیادہ کی بھی بولی نہیں لگائی۔

اُس نے مجمع پر جیسے بے بسی سے نظر ڈالی۔ ایسا لگتا تھا بولی اُس کی اُمید سے بہت ہی کم ہے۔ تھوڑی دیر تو خاموش کھڑا رہا، گردن جھکائے ہوئے۔ پھر اُس نے سر اُٹھایا، کچھ سوچتا رہا، گردن کو ایک جھٹکا دیا، اور بولا۔

''چلیے بھئی تو ہو۔۔۔ گھاٹا ہی سہی۔۔۔ ڈیڑھ روپیہ ایک، ڈیڑھ روپیہ دو۔۔۔''

اُس نے ایک بار پھر مجمع کی طرف دیکھا۔ ہر شخص خاموش کھڑا رہا۔ ایک موقع اب بھی ہے۔ ''کوئی ایک آنہ بھی بڑھائے گا تو بولی چھوڑ دوں گا۔ پھر چاہے کوئی ایک روپیہ بڑھا دے، چاقو اُسے نہ دوں گا'' اُس نے ایک اور کوشش کی۔ لگتا تھا پورے مجمع کو سانپ سونگھ گیا ہے۔

آخر اُس نے بولی چھوڑ دی۔۔۔

''نکالو بادشاہو ڈیڑھ روپے۔ دو روپے کا گھاٹا ہی سہی۔''

میں نے اپنی جیب میں اُٹھنّی ٹٹولی۔

اُس کے بعد لوگوں نے کئی چاقو خریدے۔ یہ سارے وہ تھے جو خود سے نہیں کُھلتے تھے۔ آخری بولی بارہ آنے پر چھوٹی۔ ''لیکن میری جیب میں صرف اُٹھنّی ہے۔'' یہ سوچ کر میرا دل بیٹھ گیا۔

اب اُس نے جو چاقو نکالا اُسے دُور ہی سے دیکھ کر مجھے ایسا لگا جیسے یہ وہی ہے جو میں نے ہاتھ میں لے کر دیکھا تھا۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

بولی چار آنے سے شروع ہوئی اور دو دو پیسہ کر کے بڑھنے لگی اور چھ آنے پر آ کر رُک گئی۔ وہی سب کچھ جو پہلی بولی میں ہوا تھا پھر ہونے لگا۔

میں نے اپنی جیب میں اُٹھنّی ایک بار پھر ٹٹولی اور ایک دم بولی بڑھا دی۔

''آٹھ آنے!''

ان لوگوں نے جنہوں نے دو دو پیسے بڑھائے تھے مجھے گھور کے دیکھا۔

اِس خیال سے کہ شاید کوئی بولی بڑھائے، چاقو والے نے ایک طرف سے دوسری طرف تک مجمع پر نظر ڈالی۔ کسی نے ایک پیسہ نہ بڑھایا۔

''آٹھ آنے ایک، آٹھ آنے دو'' آخر اس نے کہا

کسی طرف سے کوئی آواز نہ اُبھری۔

''آٹھ آنے تین'' اُس نے کہا اور چاقو میرے ہاتھ میں دے دیا۔

اُٹھنّی اُس کے حوالے کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے اِن آٹھ آنوں میں ساری دُنیا خرید لی ہو۔

اب میں تھا اور میرا چاقو۔ کبھی اُسے کرتے کی جیب میں رکھتا، کبھی ہاتھ میں لے کر اُس کے دستے کی چکنی لکڑی دیکھنے لگتا، کبھی اُسے کھول کر پھل پر آہستہ سے اُنگلی پھیرتا۔ اب مجھے قاضی باغ تک پیدل جانا تھا لیکن اس کا کوئی غم نہ تھا۔ فٹ پاتھ پر دھیرے دھیرے چلتے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد رُک کر جیب میں اُس کا وزن

محسوس کرتے اور ذرا سا تیز چل کر بدن سے اُس کے ٹکرانے سے پیدا ہونے والی خوشی کا مزا لیتے ہوئے میں اُس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں ایک سینما گھر تھا اور اُس کی شاندار عمارت کے باہر کے کھمبے پر کسی انگریزی فلم کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ اُس وقت کھلا ہوا چاقو میرے ہاتھ میں تھا۔ شاید اُن بہت سے لوگوں کو للچانے کے لیے جو وہاں کھڑے تھے۔

اُسی وقت ایک گورے نوجوان کی نظر اس چاقو پر پڑی۔ اس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور مجھ سے کہا

"It is a good knife, let me see it"

میں نے چاقو اسے دے دیا۔ تھوڑی دیر تک اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اُس نے چاقو اپنے دوست کو تھما دیا جس نے اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا، بند کیا اور اپنے ساتھی کو واپس کر دیا۔

میں نے چاقو مانگا تو دونوں ہنسنے لگے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اسے اپنے ساتھی کو دوبارہ دے دیا۔ میں جب بھی اپنی چیز واپس مانگتا وہ ہنسنے لگتے۔

فٹ پاتھ پر لوگ آ جا رہے تھے۔ اُن میں ایک آدھ نے رُک کر سمجھنے کی کوشش بھی کی کہ کیا ہو رہا ہے لیکن کسی نے کہا کچھ نہیں۔ میں نے ایک صاحب سے جو سوٹ پہنے اور ٹائی لگائے ہوئے تھے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں فریاد کی۔

"Sir, he is not returning my knife" ۔۔۔۔ لیکن اُنہوں نے میری فریاد پر کوئی توجہ نہ کی۔ یہی بات میں نے کئی لوگوں سے کہی مگر کسی نے جھوٹوں بھی اُن سے چاقو واپس کرنے کو نہیں کہا۔

چاقو کا غم تو تھا ہی لیکن وہ میرا مذاق بھی اُڑا رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر میں سسکیاں بھرنے لگا، پھر بھی میری حالت دیکھ کر وہ ہنستے ہی رہے۔

"Please" میں نے ایک کوشش اور کی اور ہاتھ بڑھایا تو اس نوجوان نے جس نے مجھ سے دیکھنے کے لیے چاقو مانگا تھا، اُسے پھر اپنے دوست کو دینا چاہا۔

اسی لمحہ مجھ میں جانے کہاں سے ہمت آ گئی اور میں نے جھپٹا مار کر اُس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا اور قبل اس کے کہ وہ سمجھ پائیں کہ کیا ہو گیا ہے، میں وہاں سے بھاگا تو دوسری سانس میں نے قاضی باغ میں لی۔

اور صرف ڈھائی مہینے بعد ہندوستان آزاد ہو گیا۔

■■

آندھیوں کی فصل

پانچ بج کر پندرہ منٹ ہو گئے تھے اور کسی قدر بے چینی ان سب کے چہروں سے ظاہر ہونے لگی تھی جو اس وقت ایک لمبے سے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سورج نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دوسری بار دیکھی۔ اسی وقت رِشاد نے جو اپنی بے چین طبیعت کے لیے بدنام یا مشہور تھا، اپنی پتلی پتلی ٹانگیں جنہیں وہ دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لیے اور گھٹنوں کو سینے سے تقریباً چپکائے ہوئے بیٹھا تھا، یکا یک آزاد کر دیں پھر بھی وہ اسی طرح اپنی جگہ جمی رہیں، ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

اتنے میں زینے پر کچھ کھٹ پٹ ہوئی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی تیزی سے زینے چڑھ رہا ہے۔

''کامریڈ پرہلاد آ گئے۔'' انہوں نے سوچا۔ لیکن اسی لمحہ رشیدہ نے دروازے پر رُک کر اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا، ایک ایک چہرے پر نظر ڈالی اور کہا۔

''آئی ایم ساری''

''تمہارے پاس گھڑی نہیں ہے۔'' جواہر نے اپنے سوکھے، سیاہی مائل اور

لمبے سے چہرے سے، جس پر دو بے حد ذہین آنکھوں نے اسے خاصا قبول صورت بنا دیا تھا، کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ ہونے دیا۔ لیکن رشیدہ جواہر کے اس انداز سے واقف تھی، اس لیے اس نے اپنی بات میں مزید وزن پیدا کرنے کے لیے کہا۔

''آئی ایم رئیلی ساری کامریڈ جواہر'' لیکن، اس نے ایک بار پھر ایک ایک چہرے کو غور سے دیکھا اور جملہ پورا کر دیا۔ ''کامریڈ پرہلاد بھی تو ابھی نہیں آئے ہیں۔''

''کامریڈ رشیدہ'' جواہر بے حد سنجیدہ تھا ''انقلاب نے نہ کبھی کسی کا انتظار کیا ہے، نہ کرے گا۔ جو اس کا ساتھ نہیں دے گا پیچھے چھوٹ جائے گا''

لاٹوش روڈ کے اس مکان کے پہلی منزل کی اس لمبے سے کمرے میں جس کے سامنے سری رام روڈ مانگ کی طرح سیدھی چلی گئی تھی، سات آٹھ نوجوان موجود تھے، دن بھر کے کام کی رپورٹ دینے اور اگلے دن کا پروگرام طے کرنے کے لیے۔ اُن کے چہرے اُمید اور یقین سے روشن تھے۔ انقلاب کی آہٹیں انہیں تلنگانہ، بنگال اور رائل سیما سے سنائی دے رہی تھیں، جہاں روی نرائن ریڈی، مخدوم، مجومدار اور سندریا کی قیادت میں پارٹی کے مسلح دستوں نے سیکڑوں دیہاتوں اور آس پاس کے علاقوں کو اس حد تک آزاد کرالیا تھا کہ کوئی سرکاری ملازم داخل ہونے کی ہمت بھی نہیں کر پاتا تھا۔ کوئی بھولے بھٹکے آ بھی جاتا تو پہلے لال جھنڈے کو سلامی دیتا، آس پاس کی پولیس چوکیوں میں سپاہیوں کی تعداد کے بارے میں سوالات کے غلط سلط جواب دیتا، کوئی راز ظاہر نہ کرنے کا وعدہ کرتا اور چپ چپاتا لوٹ جاتا۔ ان آہٹوں نے ان سب کے دل و دماغ میں جو کامریڈ پرہلاد کے نہ آنے سے کچھ کچھ اُلجھ رہے تھے، انقلاب کی لو کو مدھم نہ ہونے دیا تھا۔ ان کے دلوں میں شک و شبہ کا شائبہ تک نہ تھا، انہیں یقین تھا کہ ملک کے روز بروز خراب ہوتے ہوئے معاشی حالات اور عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی اُنہیں انقلاب سے قریب بلکہ قریب تر کر رہی ہے۔

لیلن کامریڈ پر ہلاد اب تک نہیں آئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد زینے پر جوتوں کی کھٹ پٹ سنائی دی۔ ساری نظریں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں اور پسینہ پونچھتے ہوئے کامریڈ پر ہلاد تیز تیز قدموں سے چھت پار کر کے کمرے میں داخل ہوئے۔۔۔۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، کندھوں سے ذرا اوپر تک لہراتے ہوئے بال، درمیانہ قد، آنکھوں پر سنہرے فریم کا نہایت خوبصورت چشمہ اور مکھن زین کے پینٹ کے اندر کی ہوئی اتنی ہی سفید قمیض۔

''کامریڈس! آئی ایم ویری ساری۔ آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔''

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دو تین چہروں پر ہلکی سی ناراضگی ضرور تھی جسے انہوں نے طرح طرح سے چھپانے کی کوشش کی۔۔۔۔ مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے کی ایکٹنگ کر کے اور لیے دیے بیٹھے رہ کر۔۔۔۔ کیوں کہ کامریڈ پر ہلاد کی خفگی۔۔۔۔ خدا نہ کرے۔

کمرے میں موجود نوجوان جواب تک بے ترتیبی سے بیٹھے ہوئے تھے، ایک دوسرے کے پاس کھسکنے لگے کہ کامریڈ پر ہلاد بیٹھ جائیں تو میٹنگ کی کارروائی شروع ہو۔

پر ہلاد نے جوتے کے فیتے کھولنے کے لیے جھکنے سے قبل چٹکی سے پکڑ کر پینٹ کی دونوں مُہریوں کو گھٹنے کے پاس سے ذرا اوپر کیا تاکہ مُہریاں اس جگہ پر جھول نہ جائیں اور پھر یکا یک کھڑا ہو گیا ''کامریڈس'' مجھے شرم آرہی ہے۔ ایک تو پورے پینتیس منٹ دیر سے آیا ہوں اور وہ بھی میٹنگ کے لیے تیار ہوئے بغیر۔ کیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے کہ میں ''ڈی کلاس'' ہو آؤں؟''

کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شاید یہ بات جواب کے لیے کہی بھی نہیں گئی تھی۔ وہ فوراً مڑا اور کھٹ کھٹ کرتا ہوا زینے اترنے لگا۔ رشیدہ نے محسن کی طرف دیکھا۔ غصّے سے اس کا چہرہ سرخی مائل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ محسن بھی خاموش رہا۔

جواہر نے اپنی لمبی لمبی ٹانگیں فرش پر پھیلا دیں لیکن جیسے ہی اس کی نظر بجیا پر

بڑی اس نے پیپر سکیٹر لیے اور اُٹھ کھڑا ہوا اور جھک کر اپنی پتلون کی بائیں جیب میں کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہاں کچھ بھی نہ ملا تو اس نے دائیں جانب ذرا سا جھک کر دوسری جیب کو ٹٹولا اور پھر اس کے اندر ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل جس میں بس تین چار ہی بیڑیاں رہی ہوں گی، نکال لیا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا تو برجیش نے دیا سلائی کی ڈبیہ اُس کی طرف بڑھا دی۔ مسکراتے ہوئے جواہر نے دو بیڑیاں ایک ساتھ جلائیں اور ہاتھ ذرا سا اونچا کر کے انہیں ہوا میں دھیرے دھیرے ہلانے لگا تو دھواں فضا میں پھیل گیا اور بیڑیوں کے سرے ڈوبتے ہوئے سورج کی دھند لکے میں جو کمرے میں کچھ زیادہ ہی اتر آئے تھے، چمک اُٹھے اور اُن دونوں نے ایک ایک کش لیا۔ رشیدہ نے برا سا منہ بنایا تو جواہر نے محسن کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دونوں اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کر خوب چوڑے سے چھجے پر چلے گئے۔

''ممکن ہے تمہارا ہی خیال ٹھیک ہو'' جواہر نے دو دن پہلے کی بات چیت کا سرا جوڑا ''کہ چارواک اس کا نام آدمی نہیں تھا۔۔۔ ویسے بھی ہندو درشن میں ناموں کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔''

''چارواک اور ہندو درشن؟''

جواہر مسکرایا، مسکرایا نہیں ذرا سا جھینپ گیا۔ کہنا اصل میں وہ 'بھارتی درشن' چاہتا تھا، جلدی میں ''ہندو درشن'' اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ محسن نے اپنی خاموشی سے یہ بات مان لی اور جواہر کو بھی اس کا اندازہ ہو گیا تو اس نے کہا۔

''لیکن گورکھپور میں بارہ فٹ لمبی جو قبر ہے اس کے۔۔۔''

''اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا'' محسن نے اس طرح کہا جیسے وہ اسے کوئی اہمیت نہ دیتا ہو اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اس نے یہ جملہ بھی جوڑ دیا ''ایسی قبریں تو ہندوستان میں سیکڑوں مل جائیں گی۔ ماموں بھانجے کی قبروں ہی کو لے لو، تقریباً ہر شہر میں ہیں، قصبوں تک میں، اور سب ہی ذرا سی ٹیڑھی بنی ہیں''

محسن خوش تھا کہ بات درشن شاستر کے گرد آ گئی تھی اور وہ بھی چارواک پر لیکن اس کے دل کے کسی کونے میں تھوڑا سا ڈر بھی تھا کہ سوسیالاجی کا اسٹوڈینٹ ہونے کے باجود تاریخ اور فلسفہ پر بھی جواہر کی گہری نظر ہے۔

جواہر نے بیڑی کی طرف دیکھا لیکن یہ طے نہ کر پایا کہ بجھ چکی ہے یا سلگ رہی ہے۔ اس نے کش لینے کا ارادہ چھوڑ دیا اور کہا ''لیکن درشن شاستر میں اس کا قد گورکھپور کی قبر کی لمبائی سے بہت بڑا ہے۔ اس نے لگ بھگ تین ہزار سال پہلے ہمیں جادوٹونے سے چھٹکارا دلانے کی کوشش کی تھی اور دُنیا کو اس طرح دیکھنا سکھایا تھا جیسی وہ سچ مچ ہے۔''

جواہر کا شمار یونیورسٹی کے ذہین طلبہ میں ہوتا تھا، اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں بھی اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ بولتا تو زیادہ نہیں تھا لیکن اکثر گہری باتیں بھی کچھ اس طرح کہہ دیتا تھا جیسے کوئی خاص بات ہی نہ ہو۔ اس نے محسن کو خاموش دیکھا تو ایک بات اور جوڑ دی۔

''لیکن ہمارے ملک نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا' اس نے اس جملے میں دُکھ ڈالا نہیں تھا، اپنے آپ ہی ٹپک پڑا تھا۔

''کس کے ساتھ انصاف کیا ہے اس ملک نے؟'' محسن نے کوئی نئی بات کہنے سے پہلے ایک طرح سے جواہر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسی وقت اسے ایک بات سوجھی۔ لیکن اب تو جملہ بہت دُور جا پڑا ہے۔ معلوم نہیں یہ اس میں جُڑے گا بھی یا نہیں، پھر سوچا دل میں رکھنے سے فائدہ۔

''۔۔۔۔ لیکن اُنہیں جو باتیں گھما پھرا کر۔۔۔۔۔۔''

جواہر کو دونوں سرے جوڑنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا ''ان لوگوں کو جو فرش پر بٹھانے کے قابل بھی نہ ہوں سنگھاسن پر بٹھانا انصاف تو نہیں کہا جا سکتا۔''

''اور جب دُنیا ہے بھی اور نہیں بھی اور سب کچھ بس برہما ہی ہے تو اس میں کیا فرش کیا سنگھاسن؟'' یوں تو محسن کی بات ٹھیک تھی لیکن اُس میں اس وقت کا لال رنگ بھی

شامل تھا۔ کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ یہی خیال شاید کچھ نرم لفظوں میں ادا کرتا۔ لیکن اس وقت وہ ذرا غصّے میں بھی تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ''ڈی کلاس'' ہونے میں پرہلاد خاصی دیر لگائے گا۔ اس کا گھر تو دُور نہ تھا مگر اس کی ماں اسے منہ ہاتھ دھو کے چائے پیے بغیر کہاں گھر سے نکلنے دے گی۔ لیکن جواہر کے چہرے پر ذہانت اور نظریہ کی پختگی کے ساتھ ساتھ اداسی کی ایک ہلکی سی لکیر دیکھ کر وہ نارمل ہو گیا۔

''کیا ہوا۔۔۔؟''

''کچھ نہیں۔''

''پھر بھی۔۔۔ اب تم اپنے دِل کی بات مجھ سے بھی چھپاؤ گے؟''

محسن کا خیال تھا کہ سدرشن کی یاد نے جواہر پر یکا یک اپنے پنکھ پھیلا دیے ہیں۔ اسے تھوڑی سی حیرت بھی تھی کیوں کہ جواہر نظریاتی طور پر بے حد مضبوط تھا اور اس وقت سے جب ڈیڑھ دو مہینے پہلے کامریڈ پرہلاد نے یہ معلوم ہونے پر کہ وہ اپنے کوٹے کے سارے پوسٹر صرف اس لیے دیواروں پر نہیں چپکا پایا تھا کہ سدرشن کے بے حد اصرار پر اس کے ساتھ پکچر دیکھنے چلا گیا تھا، ڈانٹتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

''کامریڈ، یہ وقت عشق کرنے کا نہیں ہے، عشق انتظار کر سکتا ہے۔ اس کے لیے ساری زندگی پڑی ہے لیکن انقلاب کسی کے لیے اپنی رفتار دھیمی نہیں کرے گا'' یہ کہہ کر اس نے جواہر کی طرف دیکھا تھا، اور صرف یہ اندازہ کرنے کے لیے کہ سب کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا ہے یا نہیں، اور اطمینان ہو جانے پر اس نے اپنا لکچر جاری رکھا تھا۔۔۔ ''اور انقلاب آ پہنچا اور ہم اسے تیار نہ ملے تو تو ذرا سوچو دنیا ہمیں کیا کہے گی۔ خود انقلاب ہمیں کس نام سے یاد کرے گا؟''

وہ دن اور آج کا دن جواہر نے اس سے سدرشن کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔

ررشن جواہر کے رویّے کی اس یکا یک تبدیلی پر حیران تھی اور ٹیگور لائبریری کے سامنے اس کا سبب پوچھتے پوچھتے رو پڑی تھی تو اس نے کوئی جواب دیے بغیر اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا، جواب دینے سے بچنے کے لیے یا اپنے آنسوؤں کو روکنے کی

کوشش چھپانے کے لیے۔ سدرشن کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر محسن بھی جو اس وقت جواہر کے ساتھ تھا بڑی مشکل سے خود پر قابو پا سکا تھا اور اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا تھا کہ اگر ایسا کچھ خود اس کے ساتھ ہوتا تو وہ مہالکشمی کے پل کے اس جانب ہوتا یا اُس جانب۔ اُس کے دماغ نے تو سمت کا فیصلہ کر دیا تھا لیکن دل ان دونوں کو تقسیم کرنے والی لکیر مٹا دینے پر تلا ہوا تھا۔ ثابت قدمی کے اس مظاہرے کا چشم دید گواہ ہونے کے باوجود جواہر کو اُداس، ٹوٹا ہوا اور اپنے آپ میں کھویا کھویا دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ سدرشن کی یاد اس کے دل پر لگے ہوئے تالوں کو توڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔

''کامریڈ پر ہلادنے کوئی ہمیشہ کے لیے تو پابندی لگائی نہیں ہے۔'' محسن نے جواہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''انقلاب ہمیں ہمیشہ ہی تھوڑی انتظار کرائے گا۔ بس دو چار مہینوں یا زیادہ سے زیادہ سال سوا سال کی بات ہے۔''

معلوم نہیں وہ یقین اور اعتماد کا صور جواہر کے دل میں پھونکنا چاہتا تھا یا خود اپنے دل میں جہاں شکوک اور شبہات کے خیمے کبھی کبھی ڈیرے ڈالنے کی کوشش کرتے اور وہ حیران رہ جاتا کہ جن خیالوں کو اس نے ڈھائی تین سال پہلے اُکھاڑ پھینکا تھا نہ جانے کن چور دروازوں سے داخل ہونے لگے تھے۔ لیکن فوراً ہی اسے اندازہ ہو جاتا کہ اس چور دروازے کی حیثیت ایسی جذباتی لہر سے زیادہ نہیں جو سمندر کے کسی ویران ساحل پر اپنا سر پٹک رہی ہو۔ ''نہیں کامریڈ'' جواہر بے حد سنجیدہ تھا ''ایسی کوئی بات نہیں۔ اس وقت سدرشن کا تو مجھے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا''

محسن جانتا تھا کہ جواہر اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتا اس لیے اپنے اندازے کی غلطی نے اسے اُلجھا دیا اور وہ بے وقوفوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔

''بات یہ ہے کامریڈ'' جواہر نے ایک ایک لفظ دھیرے دھیرے ادا کیا، ''میرے گاؤں سے ایک آدمی آیا ہے۔ اتفاق سے اس سے ملاقات ہو گئی تو اس نے بتایا کہ ماتا جی کی طبیعت خراب ہے۔ ان کی کھانسی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ انقلاب آنے میں ابھی کچھ دیر ہو تو میں ایک بار انہیں دیکھ آؤں''۔

حالات کے اس موڑ نے محسن کو پریشان کر دیا اور وہ کوئی ایسی بات کہنے کے لیے جس سے جواہر کی اُلجھن کم ہو جائے خیالات کے تانے بانے بُن ہی رہا تھا کہ کمرے سے رشیدہ کی آواز آئی۔

''کامریڈ پرہلاد آ گئے ہیں''

جواہر نے اُنگلیوں میں دبی ہوئی بیڑی کو، جس کا صرف ایک کش لگانے کے بعد وہ خیالوں میں اس طرح کھو گیا تھا کہ اسے اس کا خیال بھی نہ آیا تھا، دیکھا اور ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں نہ جانے کتنے غم چھپے ہوئے تھے، اسے سڑک پر پھینک دیا۔

کامریڈ پرہلاد نے میٹنگ میں اپنی جگہ سنبھال لی۔ گیبرڈین کا پرانا سا پتلون، جو جگہ جگہ سے اس حد تک گھس گیا تھا کہ کپڑے کی باریک باریک دھاریوں سے چھوٹے چھوٹے ریشے نکل آئے تھے اور مسلی مسلائی قمیص کے باوجود جو اس نے اُلٹے سیدھے طریقے سے پینٹ کے اندر اڑس لی تھی، سنہرے فریم کے چشمے اور چہرے کی شادابی کے سبب وہ دوسروں سے مختلف نظر آ رہا تھا۔

''تو، اب میٹنگ شروع کی جائے'' اس نے کہا

برجیش نے جو تقریباً ایک گھنٹے سے خاموش بیٹھا تھا اپنے سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں پر ہاتھ پھیرا، پھر کامریڈ پرہلاد کی طرف دیکھا اور کہا :

''میں بہت اچھا کامریڈ نہیں ہوں۔ ابھی پوری طرح خود کو ''ڈی کلاس'' بھی نہیں کر پایا ہوں، لیکن کامریڈ پرہلاد کیا آپ کو اندازہ ہے کہ سات آٹھ لوگ جو یہاں گھنٹے سوا گھنٹے سے بیٹھے ہیں اُن کا کُل ملا کر کتنا وقت برباد ہوا ہے؟ ہم سب لوگ یہ وقت ماس کنٹیکٹ (Mass Contact) میں لگاتے تو کچھ نہ کچھ لوگوں کے خیالوں میں تھوڑا بہت پریورتن تو کر ہی سکتے تھے''۔

''مجھے افسوس ہے'' کامریڈ پرہلاد نے اپنی ناراضگی چھپاتے ہوئے کہا ''دوبار

تو 'ساری' کہہ چکا ہوں۔ کل سے دیر نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے' جواہر کچھ اس طرح چونکا جیسے خیالوں کی کسی دوسری دُنیا سے وہ اچانک واپس آ گیا ہو۔ ''اب اس بحث میں وقت برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میٹنگ شروع ہو تو کام آگے بڑھے۔''

پرہلاد کو جواہر سے اس مدد کی امید نہ تھی۔ اس نے احسان مندی کے احساس میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، لیکن کچھ اس طرح کہ کسی کو اندازہ بھی نہ ہو سکے کہ پارٹی کے معاملات میں اس کو کسی کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اسی وقت اس نے یہ بھی سوچا کہ جواہر نے معاملہ رفع دفع نہ کر دیا ہوتا تو وہ ایسا جواب دیتا کہ برجیش بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جاتا۔

پرہلاد نے آستین تہہ کر کے کہنی تک پلٹنے کی کوشش کی لیکن جب یہ کام کئی بار کی کوشش کے بعد بھی ٹھیک سے نہ ہو پایا تو اس نے دونوں آستینوں کو جلدی جلدی کہنیوں تک چڑھا دیا اور کہا۔

''حسین آباد اسکول کے فرنٹ پر ہم اپنی منزل سے کتنی دور ہیں؟'' سوال کا رُخ جواہر کی طرف تھا۔

''پرنسپل۔۔۔۔ عباس کو داخلہ دینے پر کسی طرح تیار نہیں'' جواہر نے کہا

''عباس نہیں، کامریڈ عباس''

''آئی ایم ساری'' جواہر کو واقعی افسوس تھا۔

''اسٹوڈینٹس کا ایٹی چیوڈ (Attitude) کیا ہے؟''

''کچھ لڑکے ہمارے ساتھ ہیں، تھوڑے سے ہمارے خلاف لیکن پرنسپل کے ڈر سے۔۔۔۔''

ابھی جواہر اپنا جملہ پورا کر بھی نہ پایا تھا کہ محسن بول اٹھا

''کچھ تو ہڑتال کے لیے تیار بھی تھے لیکن میں نے سوچا کہ شیعہ کالج میں ہڑتال کرا کے وہاں سے جلوس لے کر آئیں تو وہ لڑکے بھی جو پرنسپل صاحب کے ڈر

سے کھل کر ساتھ نہیں آ رہے ہیں ہڑتال کر دیں گے۔''

''کامریڈ محسن آپ انہیں پرنسپل صاحب کہتے ہیں!''

رشیدہ اور جواہر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ''آخر کامریڈ پرہلاد کہنا کیا چاہتے ہیں۔''

پرہلاد نے ان کی آنکھوں کا سوال پڑھ لیا۔ ''کامریڈ محسن اُنہیں پرنسپل صاحب کہتے ہیں؟ ہماری کلاس اسٹرگل (Class Struggle) میں ان کا کیا رول ہے یہ نہیں دیکھتے وہ!''

یہ وارننگ اس وقت تو صرف محسن کے لیے تھی لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس طرح کی غلطی کوئی بھی دہرائے، اس لیے اس نے بات صاف کر دی، ''کامریڈس، یہ صاحب بورژوا مارلیٹی (Morality) ہے، ہم اس کو اپنی زندگی سے کھرچ کر جب تک پھینک نہ دیں گے، انقلاب بھلا کیا لا سکیں گے۔''

کوئی فوری جواب محسن کو نہ سوجھا تو اس نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا

''میں نے ایک سال اس اسکول میں پڑھا ہے۔ پرنسپل صاحب کہنے کی عادت پڑی ہوئی ہے اس لیے منہ سے نکل گیا''۔ کہنے کو تو یہ بات اس نے کہہ دی لیکن فوراً ہی سوچنے بھی لگا کہ جھوٹ پکڑا گیا تو کامریڈ پرہلاد کھال کھینچ لیں گے۔

''منہ سے نکل گیا!'' پرہلاد طنزاً مسکرایا ''کامریڈ، انقلاب کی اسٹرگل (Struggle) میں ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا پڑتا ہے، ایک ایک قدم ۔۔۔ یہ بورژوا سیاست نہیں جس میں سب پارٹیاں ایک سی ہوتی ہیں، بس ان کے نام الگ الگ ہوتے ہیں۔ ہماری پارٹی دوسری طرح کی ہے۔ میں پوچھتا ہوں انہوں نے کامریڈ عباس کو اسکول سے کیوں نکالا؟ صرف اس لیے کہ اس نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ پارٹی کے کام کی وجہ سے ہوم ورک نہیں کر سکا تھا۔ اتنی سی بات پر وائس پرنسپل شکلا نے انہیں کلاس میں پورے ایک گھنٹے کھڑا رکھا۔''

مارے غصے کے پرہلاد کچھ گڑبڑا گیا لیکن اسے فوراً ہی احساس ہو گیا اور اس

نے بات ٹھیک راستے پر ڈال دی ہے۔" اور سب کے سامنے معافی مانگنے سے انکار کرنے پر کامریڈ عباس کو اسکول سے نکال دیا۔۔۔۔ہم کامریڈ عباس کی یہ بے عزتی برداشت نہیں کریں گے اور پرنسپل کو سبق سکھا کر رہیں گے۔"

"لیکن کامریڈ!" محسن نے کہا

"لیکن کیا؟" پرہلاد سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کوئی اس کی بات کاٹنے کی ہمت کرے گا۔ آخر وہ اسٹوڈینٹ سیل کا انچارج تھا۔

اس کے باوجود محسن نے ہمت کی۔ لیکن اس کی آواز دھیمی تھی "کامریڈ پرہلاد، حسینی صاحب ایک بڑے رائٹر ہیں، ہر شخص ان کی عزت کرتا ہے"

"کرتا ہوگا ہر شخص عزت، ہوں گے بڑے رائٹر لیکن ہمارے تو کلاس اینی می (Class Enemy) ہیں۔ اور پھر وہی حسینی صاحب!"

"ساری کامریڈ" بات بڑھانے میں کوئی فائدہ نہ دیکھ کر محسن نے ہار مان لی۔

اس "ساری" نے پرہلاد کا موڈ ٹھیک کر دیا اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ محسن کے خلاف اب اس کے دل میں کچھ نہیں ہے، اس نے کسی قدر نرمی سے پوچھا "تم نے اسٹوڈینٹس کے (Attitude) کے بارے میں کیا بتایا تھا؟

کامریڈ پرہلاد کی سرزنش سے دل برداشتہ محسن نے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"پندرہ بیس اسٹوڈینٹس تو ہمارے نعرے سن کر گیٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ گیٹ بند کر دیا گیا تو بھی کچھ لڑکے ہمارے نعروں کے جواب میں اندر سے نعرے لگاتے رہے لیکن پرنسپل"، وہ ذرا سا رُکا اور اس نے پرہلاد اور دوسرے کامریڈوں کو دیکھا" کے آنے کے بعد اندر سے نعروں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔"

"ہوں!" پرہلاد کچھ سوچ رہا تھا۔

جواہر یہ سوچ کر کہ محسن گھبراہٹ یا غصّے میں جس پر وہ قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے، کچھ گڑبڑ نہ کر دے، اس کی کمک کو آ گیا۔

''کامریڈ محسن نے بہت پر جوش تقریر کی تھی۔ اسٹوڈینٹس کو بہت غصہ تھا، بار بار نعرے لگا رہے تھے، جلوس نکالنے کے لیے بھی تیار تھے لیکن اتنے تھوڑے سے لڑکوں کا جلوس نکالنے کے بجائے کامریڈ محسن نے سوچا کہ پہلے شیعہ کالج میں ہڑتال کرا دی جائے، وہاں کامریڈ ریاض ہیں اور اسٹوڈینٹس پر ان کا بڑا اثر ہے۔''

''اور شیعہ کالج میں کیا ہوا؟''

جواہر نے سوچا بھی نہ تھا کہ بات اتنی دور تک چلی جائے گی۔ وہ تو بس محسن کو ذرا سا سہارا دینا چاہتا تھا۔ یہی بات کسی اور نے کہی ہوتی تو شاید کامریڈ پرہلاد کے سوال میں اتنا زہر نہ گھلا ہوتا، اس نے سوچا۔

بات اصل میں یہ تھی کہ تین چار مہینے قبل جب اسٹوڈینٹ سیل کے انچارج کا فیصلہ ہونا تھا تو پرہلاد کے علاوہ ایک ہی نام تھا۔ جواہر۔ لیکن پرہلاد کے والد جو یونیورسٹی کے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ میں لکچرر تھے، پچیس روپے مہینہ پارٹی کو دیتے تھے اور دانشوروں کی اس سیل کے ممبر بھی تھے جو ایسے وقت پر جب پارٹی یا اس کی کسی محاذی تنظیم کی تحریک مصیبت میں گرفتار ہو جاتی معززین شہر کی مداخلت سے درمیان کا کوئی راستہ نکال کر شکست کو باعزت سمجھوتہ کی شکل دے دیتی تھی۔ انہی دو وجہوں سے آخری فیصلے کے وقت پرہلاد کا پلڑا نیچے جُھک گیا تھا۔ پرہلاد یہ جانتا تھا اور جواہر کو اپنا حریف سمجھتا تھا۔ ویسے یہ بات معلوم تو جواہر کو بھی تھی لیکن وہ دوسری طرح کا کامریڈ تھا اور اس طرح کی چھوٹی کیا بڑی باتوں کو بھی اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتا تھا۔

''تم سمجھتے ہو کامریڈ کہ محسن نے ٹھیک فیصلہ کیا تھا؟'' پرہلاد کے سوال کا رُخ براہ راست جواہر کی طرف تھا لیکن وہ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ بے کار بات بڑھانے سے فائدہ! اور پھر اسے اپنی بیمار ماں کو دیکھنے جانے کے لیے تین چار دن کی چھٹی بھی لینی تھی۔ کامریڈ پرہلاد ناراض ہو گئے تو رکاوٹیں بھی کھڑی کر سکتے ہیں، اسی سبب وہ کچھ ایسے بیٹھا رہا جیسے یہ سوال کسی اور سے پوچھا گیا ہو۔

جواہر کی رائے دریافت کرتے وقت کامریڈ پرہلاد نے محسن کو کچھ اس طرح

دیکھا کہ چاہو تو جواب تم بھی دے سکتے ہو لیکن وہ بھی خاموش رہا، دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے کہ جواہر نے چپ رہ کر ٹھیک کیا ہے۔ اب وہ بڑ کے چھتے میں ہاتھ کیوں ڈالے۔

خاموشی کو اپنی اپنی غلطیوں کا اعتراف سمجھتے ہوئے کامریڈ پر ہلاد نے دونوں کو سمجھایا، رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر جیسے وہ کوئی بہت گہری بات کہہ رہا ہو۔

''تین سوا تین سو میں پچاس ساٹھ بھی ہڑتال کے لیے تیار تھے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا، آج پچاس ہڑتال کرتے، کل وہ سو ہو جاتے اور اسی طرح ان کی تعداد بڑھتی رہتی۔ اس وقت ملک کے حالات نے ہر شخص کو چھوٹا موٹا والکینو (Volcano) بنا دیا ہے۔ آگ اور لاوا کس وقت اور کہاں پھوٹ پڑے کوئی نہیں کہہ سکتا، بس ایک چنگاری کی دیر ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کون سی ہڑتال اس چنگاری کا کام کر دے۔ اور ایک آپ ہیں کامریڈ محسن کہ آگ کو ٹھنڈا کر رہے ہیں۔''

اس خیال سے کہ آتش فشاں کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے، رشیدہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سارے ہی کامریڈوں نے پر ہلاد کی ہاں میں ہاں ملائی۔

فتح مندی کے احساس سے سرشار ہو کر اس نے اپنے اندازوں کو نظریاتی کمک پہنچائی۔

''بورژوا سماج کے تضادات کو سمجھنے کی کوشش کریے کامریڈ! عوام کی نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ ہم نے اپنی بزدلی اور غلط فیصلے سے ان کو مایوس کیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

پر ہلاد کی آواز میں تیقّن تھا، اعتماد تھا، تحکّم تھا اور جب اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کا فیصلہ پتھر کی لکیر ثابت ہوگا تو اس نے محسن کی طرف اس طرح دیکھا کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہو تو دل کا بوجھ ہلکا کر سکتا ہے۔

محسن کے دل میں بھی شکوک نہیں تھے۔ وہ بھی انقلاب کی راہ دیکھ رہا تھا اور اسے قریب تر لانے کے لیے وہ سب کچھ کر رہا تھا جو اس کے بس میں تھا لیکن وہ اب تک پارٹی

کا کینڈیڈیٹ ممبر (پارٹی کی ممبری کا امیدوار) بھی نہیں بن پایا تھا۔ اگر چہ اسے امید تھی کہ ریاستی کونسل کے ممبر اور مجاہد آزادی تواری جی جو اس کی ہمت بڑھایا کرتے ہیں اس کی مدد ضرور کریں گے، اور پھر آگے کا راستہ وہ اپنی محنت اور لگن سے خود ہی طے کرے گا۔

''تو کل کے لیے یہ طے ہوا کہ ہڑتال ہر قیمت پر ہوگی چاہے۔۔۔۔'' سنیتا نے کہا۔

سنیتا بات تو زیادہ نہیں کرتی تھی لیکن کورس کی دو تین کتابوں کے علاوہ ''اے ٹیکسٹ بک آف مارکسسٹ فلاسفی (A Text Book of Morxist Philsophy) لے کر کئی مہینوں تک پارٹی آفس میں آتی رہی تھی، اس لیے کا شمار پڑھے لکھے کامریڈوں میں کیا جاتا تھا۔

شاید اسی لیے کامریڈ پرہلاد نے اپنے جواب میں مارکس اور لینن کا حوالہ دینے کا خیال ترک کر دیا اور کہا ''ہڑتال ہر قیمت پر، ضرور، بالکل ضرور۔ چاہے آسمان ہی کیوں نہ پھٹ پڑے''۔

جواہر اور محسن کی دوستی اسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ یہ دونوں اس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ حسین آباد اسکول میں ناکامی کو بھی وہ اسی سازش کا حصہ سمجھتا تھا، ضلع پارٹی کو یہ دکھانے کی کوشش کہ اس قیادت میں نہ تو کامریڈ عباس کا داخلہ ہو سکا نہ ہڑتال۔ اس لیے اس نے ایک بار پھر محسن کی طرف دیکھ کے تیکھے لہجے میں کہا۔

''اور کامریڈ تمہیں اپنی عقل سے کام لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بار جو فیصلہ ہو گیا وہ ہو گیا۔ کل یا تو کامریڈ عباس کا داخلہ ہوگا یا اسکول میں ہڑتال، سمجھے۔''

پرہلاد نے ذرا سا رک کر ایک ایک چہرے پر نظر ڈالی اور اپنی بات جاری رکھی ''تم نے اپنی عقل استعمال نہ کی ہوتی تو یہ کام آج ہی ہو جاتا۔ کل ایسی غلطی نہ ہونے پائے، سمجھ گئے۔ ہم کمیونسٹ ایک بار قدم اُٹھانے کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔''

جواہر نے جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور دیا سلائی کی ادھ جلی تیلی سے دری پر جیسے کچھ لکھ رہا تھا، یکایک اپنی گردن اُٹھائی اور آہستہ سے بولا، لیکن اتنے

دھیرے سے بھی نہیں کہ پرہلاد سُن نہ سکے۔

''کامریڈ لینن نے کہا ہے'' ون اسٹیپ فارورڈ، ٹو اسٹیپس بیک۔

(One Step Forward, Two Steps Back)

پرہلاد کا خیال تھا کہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کی ریاستی شاخ کی قیادت کرنے والے پارٹی ممبروں میں اس سے زیادہ مارکسزم کسی کو نہیں آتا اور جواہر تو صرف کینڈیڈیٹ ممبر ہی ہے لیکن اس نے اپنی ناراضگی ظاہر نہیں ہونے دی اور یہ سوال اسٹیڈی سرکل کے اگلے ہفتے کے جلسے میں کامریڈ شفیق نقوی کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ وہ کامریڈ نقوی سے پوچھے گا کہ کیا لینن نے ایک قدم آگے دو قدم پیچھے کی بات حسین آباد اسکول کے لیے تھی۔

''کل حسین آباد اسکول میں ہڑتال ہر حال میں ہونی چاہیے اور کامریڈ محسن آپ ہی اس کام کے انچارج ہیں،'' یہ کام جواہر کے ہاتھ سے لے کر نہایت خاموشی اور چالاکی سے محسن کو منتقل کر دیے جانے کو محسوس تو سب نے کیا لیکن کہا کسی نے کچھ نہیں۔ جواہر البتہ آہستہ سے مسکرایا۔

پرہلاد کا لہجہ سیدھا اور سپاٹ تھا۔ اس نے اپنے فیصلے کا ردّعمل جاننے کے لیے ایک ایک چہرے کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔ ''امید ہے کامریڈ محسن آپ اپنی عقل کو زحمت نہیں دیں گے۔''

کچھ لوگ ہنس دیے لیکن پوچھا جاتا تو ان میں سے کوئی بھی بتانے پر تیار نہ ہوتا کہ اس کے ہنس دینے یا خاموش رہنے کے معنی کیا تھے۔

"Any doubt?"

"None"

"Good"۔ اس نے خوشی کا اظہار کیا اور پوچھا

''اور قیصر باغ چوراہے کی میٹنگ؟''

''وہ تو بہت کامیاب رہی۔''

''کتنے لوگ تھے؟''

''پچاس ساٹھ''۔ پولیس بھی آ گئی تھی لیکن عوام کا غصہ دیکھ کر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ کرسکی۔''

''اور نعرے۔؟''

''کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ نعرے بھی لگائے تھے۔''

''گڈ'' کامریڈ پرہلاد واقعی خوش تھے۔''حسین آباد اسکول میں ہڑتال ہر قیمت پر اور شام کو قیصر باغ چوراہے پر میٹنگ۔ ٹھیک چھ بجے ہم سب یہیں ملیں گے۔''

''ٹھیک چھ بجے'' جواہر نے دہرایا تو پرہلاد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

سب جیسے ایک ساتھ کھڑے ہوگئے اور نغمہ نے داہنا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے ذرا اونچی آواز میں کمیونسٹ تحریک کا عالمی ترانہ (انٹرنیشنل) شروع کیا اور فوراً ہی سب اس میں شامل ہو گئے۔

تعمیریں ہیں، خیراتیں ہیں
اور تیرتھ حج بھی ہوتے ہیں
یوں خون کے دھبّے دھن والے
دامن سے اپنے دھوتے ہیں
دامن سے اپنے دھوتے ہیں

کیوں دان کے ٹکڑے کھائیں ہم؟
سارا سنسار ہمارا ہے
سارا سنسار ہمارا ہے

سارا سنسار ہمارا ہے
آخری مصرع جو کئی بار دہرایا گیا تھا اور جس کی لے ہر بار تیز ہو جاتی تھی دیر

تک فضا میں گونجتا رہا اور ہر چہرہ بہتر مستقبل کی امید اور یقین سے چمک اٹھا اور ننھی ہوا میں لہرا کر سارے کامریڈ ایک دوسرے کو لال سلام پیش کرتے ہوئے ایک ایک کر کے زینے اترنے لگے۔

سب چلے گئے اور ایک کمرے، ایک چوڑے سے چھجے اور ایک چھوٹے سے آنگن کے پہلی منزل کے اس مکان میں جہاں تھوڑی دیر پہلے تک زندگی ہی زندگی تھی سناٹا اتر آیا تو کامریڈ نعیم نے جو آفس انچارج تھے، روپے کی دس والی پتلی سی موم بتی روشن کی کیوں کہ خستہ حال زینہ جس کا بلب کئی مہینے قبل فیوز ہو گیا تھا اور نیا اس خیال سے نہیں لگایا گیا تھا کہ بجلی کا بل زیادہ نہ آئے، اندھیرے میں ڈوب گیا تھا۔ انہوں نے سیدھے ہاتھ کی پانچوں انگلیاں اور ہتھیلی دیوار پر کچھ ایسے رکھی جیسے اسے پکڑ ہی تو لیں گے، دوسرے ہاتھ کی موم بتی کی اندھیرے سے ہار مانتی ہوئی روشنی کو زینے کے قریب کیا اور جگہ جگہ سے اکھڑی اینٹوں سے بچتے بچاتے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اترنے لگے۔ نیچے پہنچ کر دروازہ بند کیا، تالا لگایا اور زینے کسی قدر تیز رفتاری سے طے کرتے ہوئے آنگن میں آ گئے۔ یہاں بھی دروازے پر تالا لگایا اور اس خیال سے کہ کمرے میں لیٹے تو پنکھا چلانا پڑے گا اور خواہ مخواہ میٹر چلے گا، انہوں نے دری باہر کی چھت پر بچھالی اور مچھروں سے محفوظ رہنے کے لیے پتلی سی چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔

زینے پر اوپر نیچے تالا ڈالنا یوں ضروری ہو گیا تھا کہ چودہ مہینے سے کرایہ نہیں دیا جا سکا تھا اور اُڑتی اُڑتی خبر ملی تھی کہ مالک مکان نے، نیچے کے حصے میں، گھروں میں استعمال ہونے والے لوہے اور پیتل کے سامانوں کی جس کی بڑی سی دوکان تھی، کورٹ کچہری کے چکر میں پڑنے کے بجائے مکان خالی کرانے کا ٹھیکہ کچھ غنڈوں کو دے دیا تھا۔

گورے رنگ، لمبے قد اور بے حد سیاہ بالوں کے مالک تنویر نے بیرے کی کھا جانے والی نظروں کے پیشِ نظر چائے کی دوسری پیالی کا آرڈر دیا تو اس نے پوچھا ''اور

کھانے کے لیے کچھ؟''

تنویر مسکرایا ''ایک نہیں دو چائے اور چار بسکٹ''

بیرا اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

تنویر نے محسن کو ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

بہت دنوں سے محسن اس سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا، لیکن موقع ہی ہاتھ نہیں آتا تھا، کبھی وہ دوستوں اور کامریڈوں میں گھرا ہوتا اور کبھی جذبات میں ڈوبا ہوا یا آزردہ نظر آتا۔ آج اتفاق سے وہ اکیلا تھا اور اس کا موڈ بھی ٹھیک معلوم ہوتا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنا چھوٹا سا جملہ اس طرح دھیرے دھیرے ادا کرنا شروع کیا کہ تیر کے کمان سے نکلنے سے پہلے ہی اسے اندازہ ہو جائے کہ تنویر کے زخم تازہ ہونے لگے ہیں تو وہ اپنی بات کا رخ موڑ دے۔

''یار۔ تنویر۔۔۔۔ ، کتنے۔۔ دن۔۔۔۔ ہو گئے۔۔۔۔ تمہیں۔۔۔۔ نہائے ہوئے۔۔۔۔ میری مانو، کل۔۔۔۔ نہا ہی ڈالو۔۔۔۔''

یہ چھوٹا سا جملہ ادا کرنے میں اسے ایک منٹ تو لگ ہی گیا ہوگا۔ اس سارے دوران تنویر ایک ٹک اس کے چہرے پر نظریں گڑائے رہا تھا۔ کوئی ردِ عمل نہ تھا۔ نا گواری کا، نہ خوشی کا۔ وہ سب کچھ خاموشی سے سنتا اور میز پر رکھی ہوئی شکر دانی پر بنے ہوئے نقش و نگار دیکھتا رہا، پھر دھیرے دھیرے اس نے پلکیں اٹھائیں اور اپنی لمبی لمبی انگلیوں کو جن کے پوروں پر اور ناخنوں کی جڑوں میں مَیل کی تہیں جمی ہوئی تھیں دیکھا اور محسن پر حقارت کی نظر ڈالی اور مسکرا دیا۔ یہ مسکراہٹ طنزیہ تھی۔

''تم کہتے ہو کل نہا ڈالوں۔ اوّل تو میرے پاس اتنا وقت کہاں اور دوسرے یہ کہ ایک ایسے وقت جب پوری قوم، چالیس کروڑ لوگ، اور پورا ملک غلاظت میں لت پت کر دیا گیا ہو، ایک شخص کے نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہننے کے کیا معنی؟''

''پھر بھی۔'' محسن کو کوئی دلیل نہ سوجھی تو اس نے کچھ کہے بغیر ہی کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ اپنی پرانی بات کیوں نہیں دہراتے، یہی کہ میں نہا دھوکر، کوٹ پتلون ڈاٹ کر نکہت کے یہاں گیا ہوتا تو اس کے بھائی میرے ساتھ بے عزّتی کا سلوک نہ کرتے۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟''

تنویر کو سیدھی سادی بات میں بھی ڈرامہ پیدا کر دینے کا گُر خوب آتا تھا۔

اس نے سگریٹ کا لمبا کش لیا، ایش ٹرے میں راکھ جھاڑی۔

''تمہارے خیال میں میرے اور نکہت کے درمیان میرا نہ نہانا اور یہ میلے کپڑے حائل ہیں''، اُس نے اپنی قمیص اور پینٹ کی طرف جو کچھ ایسے گندے نہ تھے، اشارہ کیا اور چند منٹ تک محسن کو گھور کر دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

''کیا تم طبقات کا تضاد بھول گئے۔ بھول گئے کہ اس کے دو سگے اور دو خالہ زاد بھائی آئی۔ سی۔ ایس آفیسر ہیں، ''ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ۔'' میں اطلس و کمخواب کے کپڑے پہن کر اور عرقِ گلاب سے غسل کرنے کے بعد بھی اس کے یہاں جاؤں تو قابلِ قبول نہ ہوں گا۔''

''اور تمہارے والد، چچا اور.............''

تنویر نے سگریٹ کی راکھ ایک بار پھر ایش ٹرے میں جھاڑی اور چہرے پر ناگواری کا تاثر پیدا کیے بغیر کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم اپنا آخری حربہ استعمال کرو گے۔ میرے والد اور چچا ڈپٹی کلکٹر تھے، اس نظام کا حصّہ تھے جس نے ہمیں سو برس تک غلام بنائے رکھا تو مجھے اس کے لیے کیسے ذمّے دار قرار دیا جا سکتا ہے۔؟''

''میں نے یہ کب کہا کہ تم اس کے ذمّے دار ہو!'' اب محسن پریشان ہو گیا تھا۔

''اچھا مان لیا، تم نے ذمّے داری کا ٹوکرا میرے سر پر نہیں اُنڈیلا ہے تو پھر تم چاہتے کیا ہو؟ میں باپ اور چچا کے عہدوں کو اپنے وقار کی چادر کی طرح اوڑھ کر نکہت کے یہاں جاؤں۔'' تنویر کا یک شمشیرِ بے نیام ہو گیا اور اس کی ناک اور کان کی لویں سرخ ہو گئیں۔ ''میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی ملازمت اور وفاداری کی ایسی اتفاقی یا ارادی

روایت پر جو کسی کو ڈپٹی کلکٹر بننے میں مدد دیتی ہے۔''

بیرے نے چائے لا کر کپ میز پر رکھ دی یہ انہیں معلوم ہی نہیں ہوا اور نظر پڑتے ہی محسن نے ایک بسکٹ اُٹھالیا اور طشتری تنویر کی طرف بڑھادی، بات بدلنے کے لیے۔

تنویر یہاں ایک گھنٹے سے ضرور بیٹھا ہوگا۔ محسن نے سوچا۔ پچھلے بیس پچیس منٹ میں ہی اس نے دیکھا تھا کہ تین چار لوگ کوئی کرسی خالی نہ ہونے کی وجہ سے لوٹ گئے تھے۔ اُسی وقت اس نے دیکھا کہ بیرا ایک چھوٹی سی تختی جس پر ''یہاں بیکار بیٹھ کر اپنا وقت برباد نہ کیجئے۔'' لکھا تھا، بغل میں اس طرح دبائے کھڑا تھا جیسے وہ نہ چاہتا ہو کہ تنویر کی اس پر نظر پڑے لیکن چھپانے کا یہ کھیل اس طرح کھیلا جا رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہر ایک کی اس تختی پر نظر پڑ ہی جائے۔

تنویر دیوار کی طرف مُنہ کر کے سگریٹ کے کش پہ کش لے رہا تھا، ساری دُنیا سے، اپنے آپ سے بیزار۔ محسن نے چائے کے پیسے دینے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو تنویر جیسے خواب سے جاگ پڑا۔

''اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں کام کرنے یا ایک آدھ بار جیل ہو آنے سے کوئی کمیونسٹ نہیں ہو جاتا۔ دان کے ٹکڑے کھانا ہی نہیں کھلانا بھی اس نظام کا حصہ ہے جس پر میں تھوکنا بھی پسند نہ کروں گا۔''

محسن نے جیب سے ہاتھ نکال لیا۔ بیرا بل لے آیا۔ تنویر نے خوب اچھی طرح گن کر چار آنے زیادہ رکھے تو اس نے سلام مارا۔

تنویر ہنسا ''کل تختی بغل میں داب کر نہ آنا۔''

ارے یہ شخص تو شبنم بھی ہے۔ محسن نے سوچا۔ میں تو اسے صرف شعلہ سمجھتا تھا۔

کرسی سے اٹھتے ہوئے اس نے تنویر کا کندھا تھپتھپایا ''مجھے یونیورسٹی جانا ہے، وہاں ایک ضروری کام ہے۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''فی الحال تو باہر چلتے ہیں، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔'' وہ مسکرایا

''کل تم؟''

''ہاں، آج بس موڈ نہیں ہوا۔ شام کو پارٹی آفس ساتھ ہی چلیں گے۔ قیصر باغ کی میٹنگ کے بعد۔ کیا کامریڈ پرہلاد پوچھ رہے تھے؟''

''پوچھ تو نہیں رہے تھے لیکن تمہاری اور کامریڈ برجیش کی کمی ضرور محسوس کی گئی۔''

اس نے کم سے کم تنویر کی حد تک جھوٹ ہی بولا تھا۔

کامریڈ برجیش شاید ہی کہیں وقت پر پہنچتے ہوں۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا کہ جس جگہ بھی جانا ہوتا اس کے آس پاس کی سڑکوں پر تین چار چکّر لگاتے، پھر کہیں چائے پینے بیٹھ جاتے اور پھر اُنہیں جیسے ایک دم خیال آتا، جلدی جلدی چائے حلق میں انڈیلتے اور منزل کی طرف روانہ ہو جاتے۔

اسی عادت کی وجہ سے ان کا نام ہی ''کامریڈ شٹنگ'' پڑ گیا تھا۔

وہ تو محسن نے تنویر کا دل رکھنے کے لیے بات بنادی تھی ورنہ ہوا بس یہ تھا کہ میٹنگ ختم ہونے پر وہ تناؤ جو پرہلاد کے دیر سے آنے، ڈھکے چھپے طریقے سے جواہر کو دوسروں کی نظروں میں ذلیل کرنے اور محسن کو بے وقوف ثابت کرنے کی کوشش سے پیدا ہو گیا تھا، ختم کرنے میں کامریڈ برجیش کی شٹنگ کی عادت نے بہت مدد کی تھی۔

اصل میں سیڑھیوں پر کسی کے دھیرے دھیرے چڑھنے کا اندازہ کر کے ہر شخص یہی سمجھا تھا کہ برجیش ہوگا لیکن زینے کے دروازے سے دونوں ہاتھوں میں چائے کے آدھے بھرے، آدھے خالی گلاسوں کے دو چھینکے لیے سڑک کے کنارے والے عبدل کے ہوٹل کا لڑکا برآمد ہوا تھا تو لوگوں کے لیے اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس ہنسی میں کسی امید کے بغیر چائے مل جانے کے امکان کی خوشی بھی شامل تھی۔

سری رام روڈ اور لاٹوش روڈ کے تراہے کے اس مکان کی میٹنگ میں جو ہفتے میں تین دن تو ضرور، اور ایسی ہی کوئی خاص بات ہو جائے، تو ہر روز بھی ہوتی تھی، چائے پینے پلانے کا کوئی دستور نہ تھا۔ لیکن اس وقت ہوا یہ تھا کہ ایک دن پہلے ہی گھر سے نعیم خاں کا بیس روپوں کا منی آرڈر آیا تھا اور اس وقت انہیں جانے کیا سوجھی تھی کہ وہ چپکے سے نیچے جا کر آدھے کوپ چائے کا آرڈر دے آئے تھے۔

چائے پی کر رشیدہ نے کہا تھا ''اب کامریڈ برجیش آ بھی جاتے تو کونسا تیر مار لیتے ،ان سے زیادہ کام کا تو یہ چھینکے والا لڑکا نکلا''

ہنس تو رشیدہ کے اس جملے پر کامریڈ پرہلاد کے علاوہ سب ہی دیے تھے لیکن زوردار قہقہہ اس وقت لگا تھا جب جواہر نے گردن اٹھائے بغیر اپنی عادت کے مطابق دھیمے سُر میں کہا تھا۔

''آج شاید شنٹنگ کی ڈبل ڈیوٹی لگ گئی ہے''

قہقہہ اتنا زوردار تھا یا شاید اس لیے کہ یہ جواہر کے جملے کا نتیجہ تھا، کامریڈ پرہلاد یکا یک پھٹ پڑے تھے۔

''آپ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کامریڈس! آپ لوگ سڑک چھاپ ہوٹل کے معمولی سے لڑکے سے ایک کامریڈ کا مقابلہ کر رہے ہیں۔آپ لوگوں کو کمیونسٹ مینرس کا خیال ہے نہ کمیونسٹ مارلیٹی کا۔ یہ بورجواژی عادتیں چھوڑے بغیر آپ اچھے کمیونسٹ کیسے بن پائیں گے؟''

تلخ واقعات کے اس چھوٹے سے دوسرے سلسلے میں بھی تنویر کا نام تک نہ آیا تھا لیکن محسن نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل کی باتوں کے حوالے سے نکہت کی یاد اس کے دماغ کے کسی کونے میں بھی رہ جائے۔کمی محسوس کی جانے کی بات اس نے اسی لیے کہہ دی تھی۔

حسین آباد اسکول سے سیدھے یونیورسٹی جانے کے بجائے وہ امین آباد چلا آیا تھا۔آج کے معرکے کی ناکامی سے اس کا دل بجھ گیا تھا۔کل شام کے فیصلے کو عملی شکل دینے کے لیے حسین آباد پہنچتے ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ماحول کل سے بھی زیادہ سرد ہے۔ہوا یہ تھا کہ اسٹوڈینٹس فیڈریشن کے چھے سات طلبہ تو اپنے کلاسوں میں گئے ہی نہیں تھے اور نیم کے درخت کے نیچے دوسرے کامریڈس کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ آجائیں تو ہڑتال کرانے کی کوشش کی جائے۔انتظار کرنے والوں میں ظہیر عباس بھی شامل تھا۔اسکول کے اندر پرنسپل صاحب چند دوسرے اساتذہ اور کئی کلاسوں کے

مانیٹروں کے ساتھ گشت لگا رہے تھے۔کل جب باہر سے نعرے لگائے گئے تھے تو اپنے اپنے درجوں سے دو دو چار چار کر کے ساٹھ ستر لڑکے باہر نکل آئے تھے لیکن آج اس کی آدھ گھنٹے کی پر جوش تقریر کے باوجود کلاس چھوڑ کر باہر آ جانے والوں کی تعداد کسی طرح پچیس تیس سے زیادہ تھی، نہ کل والا جوش وخروش تھا ان میں۔

برف کی اس سل کو توڑنے کے لیے محسن نے ظہیر عباس کو تقریباً گھسیٹ کر میڈیکل کالج کے پیچھے کی چار پانچ فٹ اونچی ٹوٹی پھوٹی دیوار پر تقریر کرنے کے لیے کھڑا کر دیا تھا۔

دیوار پر مضبوطی سے قدم جمانے کے بعد، ظہیر عباس نے طلبہ پر جن کی تعداد چالیس پچاس سے زائد نہ ہوگی ایک طائرانہ نظر ڈالی، مسکرایا اور حسب عادت اس نے اپنے بالوں کو جو بار بار چہرے پر بکھر جاتے تھے، ہاتھ پھیر کر پیچھے کیا تو ان میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی اور انھوں نے آپ ہی آپ ایک پر جوش نعرہ لگایا۔ایسے موقعوں پر ہوتا اکثر یہ تھا کہ پہلی آواز وہی بلند کرتا تھا لیکن آج نہ جانے کس نے ''کامریڈ ظہیر عباس'' کے نام کا نعرہ لگا دیا اور سب نے مل کر اس قدر جوش سے ''زندہ باد، زندہ باد'' سے جواب دیا کہ سب کے چہرے کھل اٹھے۔محسن کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔اس نے اشارہ کیا تو ظہیر عباس نے تقریر شروع کی۔خطابت اور ایک ہی بات کو بار بار نئے انداز میں کہنے کی اس کی کوشش کو شروع میں تو کچھ کامیابی ملتی نظر آئی لیکن پھر جلد ہی اس سب پر ایک طرح کا پھیکا پن چھا گیا۔سب ہی کو معلوم تھا کہ اسے کیوں اور کس طرح اسکول سے نکالا گیا تھا اور بات کہاں آ کر اٹک گئی تھی۔وہ اس میں نیا پن کہاں سے بھر دیتا؟

بیچ بیچ میں دو چار نعرے ضرور بلند ہو جاتے اور کبھی کبھی یہ بھی لگتا کہ آج کامیابی ضرور ہوگی لیکن ہڑتال کرانے کے لیے جس قدر جوش وخروش کی ضرورت تھی اس میں ایک آنچ نہیں کئی آنچ کی کسر رہ جاتی۔

اسی دوران پرنسپل اور ہڑتال مخالف طلبہ کی ٹولی سامنے کے کلاسوں سے جیسے ہی پیچھے کی طرف مڑی سات آٹھ لڑکے اپنے بستے لیے ہوئے دیوار پھاند کر باہر آ گئے۔

اس وقت یہ ایک بڑی کامیابی تھی، جس کا خیر مقدم پرشور نعروں سے کیا گیا۔

ہر زور ظلم کی ٹکر میں
ہڑتال ہمارا نعرہ ہے

جو ہم سے ٹکرائے گا
چور چور ہو جائے گا

کامریڈ عباس کا داخلہ
ہو کر رہے گا، ہو کر رہے گا
کامریڈ عباس کا داخلہ
روک سکو تو روک لو

جوش و خروش کی ایک نئی لہر اُس وقت دوڑ گئی جب شکلا جی جو، حسینی صاحب چھٹی پر ہوتے تو ان کا کام بھی دیکھتے تھے، لمبا سا کھدر کا کرتا اور کھدر ہی کا پاجامہ پہنے دو چار دوسرے ٹیچروں اور چار پانچ اسٹوڈینٹس کے ساتھ اسکول کے مقفل گیٹ کے پاس پہنچے اور انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے محسن کو بلایا۔ ظہیر عباس اور ہڑتال کے حامیوں نے اسے کامیابی کی جانب ایک بڑا اقدم تصور کیا اور وہ زیادہ اونچی آواز میں نعرے لگانے لگے۔

اس خیال سے کہ معاملات شاید بات چیت کے ذریعے ہی طے ہو جائیں اور ہڑتال کرانے میں ناکام رہنے کا داغ اُس پر نہ لگے، محسن خوش تو ہوا لیکن فوراً ہی اسے خیال آیا کہ ہڑتال ہوتی اور وہ جلوس لے کر کرچین کالج، جہاں وہ پچھلے سال تک پڑھتا تھا، جاتا تو بات ہی اور ہوتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ شام کی ریویو میٹنگ میں کامریڈ پرہلاد اس کی تعریف میں دو چار لفظ بھی کہہ دیتے۔ ایک عظیم مقصد کے حصول میں اس معمولی،

بے حد معمولی لیکن خود اس کے لیے بے حد اہم کامیابی کے اس طرح ہاتھ سے نکل جانے کے امکان نے اُسے تھوڑا سا ملول بھی کر دیا۔

وہ گیٹ کی طرف بڑھا تو سات آٹھ دوسرے طلبہ بھی اُس کے ساتھ ہو لیے لیکن اُس نے صرف تین چار کو اپنے ساتھ لے کر کہا کہ اصل ضرورت تو آپ کی اُس وقت پڑے گی جب نعرے لگائے جائیں گے اور بات چیت کے دوران نعروں کی آواز جتنی تیز ہوگی شکلا جی پر اتنا ہی دباؤ بڑھے گا۔

شکلا جی نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پوچھا

''تم اسٹوڈینٹ ہو؟''

''ہاں'' (جی ہاں''نہیں)

''کس کالج میں پڑھتے ہو؟'

''یونیورسٹی میں''محسن نے فخر سے کہا۔

''یونیورسٹی کے کلاسیز حسین آباد میں کب سے لگنے لگے؟ - جائیے یہاں شور نہ مچائیے اور لڑکوں کو پڑھنے دیجیے۔'' شکلا جی نے کہا۔

''جب تک ظہیر عباس کا داخلہ نہیں ہوگا ہم لوگ یہاں سے نہیں جائیں گے''، اس نے تقریباً چیختے ہوئے جواب دیا۔

''ظہیر عباس آپ لوگوں کا کون ہے؟'' شکلا جی نے پوچھا

''اسٹوڈینٹس فیڈریشن کا ممبر ہے۔''محسن نے فخر سے کہا

''میرا بیٹا ہے! اُس نے پرنسپل صاحب سے بدتمیزی کی ہے۔ میں اپنے بیٹے کو معافی مانگے بغیر اسکول میں دوبارہ داخل نہ ہونے دوں گا، شکلا جی کے لہجہ میں نہ تلخی تھی نہ غصہ۔''اس کے بغیر داخلہ نہیں ہوگا، ہرگز نہیں ہوگا۔''

''ہوگا کیسے نہیں!''محسن آپے سے باہر ہوگیا تو اُنہوں نے لوہے کی زنجیر سے باندھے ہوئے گیٹ کے دونوں پٹوں کے درمیان ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''ایسے تو ہونا مشکل ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اسکول کے آفس کی طرف مڑے۔

''ہم کامریڈ عباس کا داخلہ کرا ہی کے دم لیں گے۔'' محسن نہایت غصّے کے عالم میں بولا۔

شکلا جی آگے بڑھتے بڑھتے رُک گئے۔ پلٹ کے دیکھا، مسکرائے اور دھیرے سے بولے۔

''تو کرا لو''

اب کچھ لڑکے گیٹ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر محسن کو کچھ زیادہ ہی جوش آ گیا۔

''یہ شکلا ایسے نہیں مانے گا۔ گیٹ پر تالہ ڈال کے سوچتا ہے ہمیں اندر جانے سے روک لے گا۔ تین فٹ اونچی یہ دیوار بھلا ہمیں روک سکے گی؟''

کہنے کو تو اس نے یہ بات کہہ دی لیکن یہ ہوگا کیسے؟ سات آٹھ بلکہ شاید دس گیارہ لڑکے تو ذرا سے اشارے پر باونڈری وال پھلانگ کر اسکول میں گھس جائیں گے، لیکن اس سے کیا ہوگا۔ انہیں تو چپراسی اور دو چار دبنگ ٹیچرس ہی کھدیر دیں گے۔ اُسی وقت اسے خیال آیا کہ شکلا جی کا اسے بات کرنے کے لیے بلانا دراصل ایک گہری سازش کا حصّہ تھا۔ میں اس میں خواہ مخواہ پھنس گیا۔ کامریڈ پرہلاد نے مجھے ٹھیک ہی اپنی عقل استعمال کرنے سے منع کیا تھا۔ اُس وقت اسٹوڈینٹس جوش میں تھے، نعرے لگا رہے تھے۔ اُن سے کہا جاتا کہ اسکول میں گھس جاؤ تو سب دوڑ پڑتے، خیر جو ہوا سو ہوا۔ کوئی اسٹوڈینٹ گیا تو ہے نہیں سب ہی موجود ہیں۔

یہ سوچ کر اس نے ادھر ادھر بکھرے ہوئے لڑکوں کو جمع ہو جانے کا دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا اور اُچک کر سامنے والی دیوار پر چڑھ گیا اور جیسے ہی سارے لڑکے اکٹھا ہو گئے اس نے تقریر شروع کر دی۔

''کامریڈس۔ کامریڈ عباس کو اسکول میں پھر سے داخل کرانے اور رسٹی کیشن واپس لینے کی بات چیت ٹوٹ گئی ہے۔ وہ بات چیت نہیں تھی، دھوکا تھا دھوکا''۔ ابھی

وہ یہیں تک پہنچا تھا کہ کسی نے نعرہ لگا دیا۔

''دھوکے بازی''

جواب بھی زوردار طریقے سے دیا گیا۔

''نہیں چلے گی نہیں چلے گی''

طلبہ کے اس جوش وخروش سے اُس کی جان میں جان آئی اور اُسے ایسا لگا جیسے ہاری ہوئی بازی اس نے دوبارہ جیت لی ہو۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے اُس نے سوچا کہ ظہیر عباس کو ایک بار پھر تقریر کرنے کے لیے بلانے سے پہلے دو چار زوردار نعرے لگوالے اور جب کامریڈ عباس ماحول کو خوب گرما دیں تو دھاوا بول کر شکلا کے بچے سے دو دو ہاتھ کر ہی لیے جائیں۔

اس نے جلدی جلدی اپنی باتیں پوری کیں لیکن اس طرح نہیں کہ معلوم ہو وہ کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ظہیر عباس کو دعوت دے رہا ہے۔ اس کے باوجود اس کا آخری جملہ تھا۔

''ویسے تو یہ لڑائی کامریڈ عباس کے ساتھ پرنسپل حسینی کے خراب برتاؤ کی وجہ سے شروع ہوئی تھی لیکن اب یہ سارے اسٹوڈینٹس کی عزت کی، اُن کے حقوق کی لڑائی بن گئی ہے اور یہ لڑائی ہم نے جیت لی تو کامیابیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگا اور نئی لڑائیوں کا بھی۔ لیکن میں کامریڈ عباس کو دعوت دینے سے پہلے ان سے یہ درخواست بھی کروں گا کہ وہ ہمیں بتائیں کہ اس نزاکت وقت میں ہم کون سا قدم اُٹھائیں''

اُس نے ایک بار پھر اپنے سامنے اور دونوں طرف پھیلے ہوئے اسٹوڈینٹس پر نظر ڈالی۔ کئی چہرے نئے تھے، پندرہ بیس تو ضرور رہے ہوں گے۔ یہ سب اس کی تقریر کے دوران موقع ملتے ہی دیوار پھاند کر آ ملے تھے۔ ''تو کامریڈس'' اس نے کہا ''اب میں کامریڈ عباس کو تقریر کرنے کے لیے دعوت دیتا ہوں لیکن اُن کے اس جگہ آنے سے پہلے میں یہ ضرور چاہوں گا کہ ہم سب اُن کا استقبال دو چار زوردار نعروں سے کریں۔''

یہ کہہ کر اس نے ہاتھ ہوا میں بلند کیا، سامنے کی بھیڑ پر نظر ڈالی اور اپنی پوری

طاقت سے نعرہ لگایا۔

''دُنیا کے مزدورو''

دو چار مریل سی آوازیں اُبھریں

''ایک ہو''

اس نعرے پر کچھ اسٹوڈینٹس تو زور سے ہنس بھی دیے، ویسے مسکراہٹ سب ہی چہروں پر پھیل گئی تھی۔ ہوا اصل میں یہ تھا کہ کئی مہینے پہلے ریلوے اسٹرائک کی تیاریوں کے دنوں میں تھوڑے سے دوسرے اسٹوڈینٹس کے ساتھ اسے بھی اس کام پر لگا دیا گیا تھا۔ موتیا میں لوکو شیڈ کے پاس ریل روڈ ورکرس یونین کا ایک چھوٹا سا آفس ان دنوں چوبیسوں گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ مزدور تو ہر وقت آتے جاتے ہی رہتے تھے، مقامی ٹریڈ یونین لیڈر بھی نکڑ سبھاؤں اور ہڑتال کی خفیہ تیاریوں سے فرصت ملنے پر وہاں آ جاتے۔

یونیورسٹی اور ان کالجوں سے جہاں اسٹوڈینٹس فیڈریشن کی شاخیں تھیں جن طالب علموں کو بھی اس محاذ پر لگا دیا گیا تھا، محسن بھی اُن میں شامل تھا۔ یہ لوگ نہ تو ریلوے کے مزدوروں کو جانتے تھے نہ ان کی زبان میں ان سے بات چیت ہی کر پاتے تھے لیکن یہ ضرور تھا کہ اُنھیں اپنے درمیان دیکھ کر مزدروں کو یہ احساس ہوتا تھا کہ اس لڑائی میں وہ اکیلے نہیں ہیں اور جب وہ بھی نعرے لگاتے تو اُن کے دل جوش سے بھر جاتے تھے اور وہ بھی اپنی پوری طاقت سے نعرے لگانے لگتے تھے۔

یہ نعرہ اسی تجربہ کی دین تھا۔

محسن نے اپنی غلطی کی تلافی کے لیے دوسرے نعرے ضرور لگائے، چار چھے لڑکوں نے ان کے جواب میں بھی نعرے لگائے لیکن اب ماحول غیر سنجیدہ ہو گیا تھا اور اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کلاسوں میں واپس جانے کے لیے تین چار لڑکے اسکول کی چار ساڑھے چار فٹ اونچی دیوار پھاندر ہے ہیں۔

منزل کے اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد اپنی کئی دنوں کی کوششوں پر پانی

پھرتے دیکھ کر وہ روہانسا سا ہو گیا تھا اور تنہا ہوتا تو شاید پھوٹ پھوٹ کے رونے بھی لگتا۔

میڈیکل کالج کے چوراہے پر ایک منٹ رُک کر وہ سوچتا رہا تھا کہ قاضی باغ، جہاں وہ رہتا تھا، چلا جائے۔۔۔۔ لیکن وہ اُس کا گھر نہ تھا۔ اس کا کوئی گھر ہوتا تو وہ دل گرفتگی کے اس عالم میں وہیں جاتا اور اپنے آپ کو بستر پر ڈھیر کر کے سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے چھت کو آسمان کی طرح ایک ٹک دیکھتا رہتا اور آنسو بہہ نکلتے تو انہیں پونچھتا بھی نہیں، بہنے دیتا۔ لیکن وہ جہاں رہتا تھا وہاں سر کے اوپر چھت تو تھی، ایک چھوٹا سا کمرہ بھی تھا جس میں اس کے ماموں زاد بھائی بھی رہتے تھے، کئی لوگ تھے اس گھر میں، مرد ایک، عورتیں دو اور دو تین لڑکیاں بھی، لیکن اس مکان اور اس میں رہنے والوں اور اس کے درمیان وہ رشتہ نہیں تھا جو اینٹ گارے کی دیواروں کو گھر بنا دینے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

وہاں اس کی بیوہ ماں بھی تھی لیکن وہ خود کو اس کی نظروں سے چرائے چرائے پھرتا تھا۔ اس کا رات میں دیر سے گھر آنا، مکان کی پشت کے چھوٹے سے پارک کی کندھے تک اونچی دیوار پر سر ٹکا کر گھنٹوں چپکے چپکے اپنے آپ سے باتیں کرنا، پوسٹروں کے بنڈل بغل میں دبائے دبائے آنا اور پھر مکان کے باہری حصے کے چھوٹے سے دروازے میں خاموشی سے تالا ڈال کے چوروں کی طرح نکل جانا اور تین تین بجے رات میں لوٹ کے آنا، یہ سب کچھ ایسا تھا جو نہ وہ ماں کو سمجھا سکتا تھا اور نہ شاید اس کی سمجھ ہی میں آتا۔

کبھی کبھی وہ چوڑی سی سل پر ماں کو مسالہ پیستے ہوئے دیکھتا تو اس کی آنکھوں کے سامنے ان کی وہ تصویر پھر جاتی جس میں وہ سترہ چھوٹے بڑے کمروں، دالانوں اور بڑی بڑی چھتوں کے مکان میں شام کے وقت صحن میں بچھے ہوئے تین چار پلنگوں میں سے ایک بڑے سے پلنگ پر بیٹھی ہوتیں اور پان کھانے کے لیے پاندان کھولتیں اور اس میں بے ہنگم طور پر کٹی ہوئی چھالیہ پر ان کی نظر پڑتی تو مسکراتے ہوئے کہتیں۔

''منیر کی اماں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ سب کام ایک ایک کر کے بھولے جا رہی ہو''
پھر جیسے اُنہیں خیال آتا کہ وہ کہیں سُن نہ لیں اس لیے آواز نیچی کرتی ہوئی کہتیں
''چھالیہ ایسی خراب کتری ہے کہ کبھی تالو میں چبھتی ہے کبھی زبان میں۔''
''کیا مجھ سے کچھ کہا بہو؟'' منیر کی اماں پوچھتیں۔
وہ انھیں بہو ہی کہتیں کیوں کہ والد کو انھوں نے گودوں کھلایا تھا۔
''نہیں منیر کی اماں تم سے نہیں'' وہ مسکراتیں۔
''کل بگھار کی پیاز جل گئی تھی۔ آج کر چھا چولھے میں سے ذرا جلدی نکال لینا''
''منیر کی اماں سنی اَن سنی کر دیتیں اور وہ ماہنامہ ''کامیاب'' یا ''خاتون مشرق''
کے صفحات پلٹنے لگتیں۔ اور کہاں آج یہ حال تھا کہ وہ کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچتیں کہ دوسرا کیا سننا چاہتا ہے، بات کا کونسا رُخ اسے پسند آئے گا۔ لیکن پھر بھی وہ سب کو ہمیشہ خوش نہ رکھ پاتیں، آخر رُخ ہی تو تھوڑا بہت بدلا جا سکتا ہے۔ یوں تو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بھی کہا جا سکتا ہے لیکن اس عمر میں نیا سبق بھلا کوئی کیسے سیکھے۔ اس لیے وہ بڑی بھابھی کو خوش رکھنے کی زیادہ کوشش کرتیں تو اکثر اُلجھ جاتیں اور اپنی بات کی چنٹیں دور کرتیں تو اس کا کپڑا کہیں سے مسک جاتا اور کبھی کبھی تو پھٹ بھی جاتا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ جو کچھ وہ کر رہا ہے اسے وہ اچھی طرح جان بھی لیں، مان بھی لیں تب بھی کچھ ایسی خوش نہ ہوں گی۔ اس نے تین برسوں میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا تھا تو وہ مارے خوشی کے رونے لگی تھیں۔ لیکن یہ صرف خوشی کے آنسو نہ تھے، ان میں بہت کچھ دکھ بھی شامل تھا۔ ان کے آنسو پونچھتے پونچھتے وہ خود بھی رونے لگا تھا تو انھوں نے رونے کی ایک اور سبیل نکال لی تھی۔
''بیٹے، تمہارے ابا کہتے تھے تو ہائی اسکول کر لے گا تو پڑھائی کے لیے تجھے لندن بھیج دیں گے۔ خدا جانے بھیج پاتے یا نہ بھیج پاتے لیکن تو یونیورسٹی جائے گا تو میں جانتی ہوں وہ بہت خوش ہوں گے، جہاں بھی ہوں۔''

وہ دونوں ہاتھ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے، بہت دیر بیٹھے رہے تھے۔ خاموش گم سم۔

اس وقت گھر میں ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ سب لوگ پکچر دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ اصل میں ماموں جان ایک ایسے محکمے میں ملازم تھے کہ جب چاہتے گھر کے سب لوگوں کے لیے سینما کا پاس لے آتے۔ پاس والدہ کے لیے بھی آتا تھا اور اس کے حصے کا بھی۔ وہ مشکل ہی سے پکڑ میں آتا اور وہ جاتی نہ تھیں۔ اُس اتوار کے بعد جب ان کا گراموفون اور رکارڈوں سے بھرے ہوئے ٹین کے دو ڈبے نخاس کے بازار میں ساڑھے سینتیس روپے میں بکے تھے، اُنہوں نے خود سے قسم کھالی تھی کہ اب پکچر کبھی نہ دیکھیں گی۔

کئی مہینے پہلے شام کے وقت جب ماموں جان روپے لے کر آئے تھے وہ نماز پڑھ رہی تھیں اس لیے انہوں نے چھوٹی سی پوٹلی، کہ یہ سب سکے ہی سکے تھے، ان کے پیروں کے پاس جانماز کے نیچے رکھ دی تھی۔ نماز ختم کرنے کے بعد انہوں نے پوٹلی اٹھاتے ہوئے بس اتنا کہا تھا۔

''مرحوم نے یہ باجا اکیس روپے میں خریدا تھا۔ دو رکارڈ اور ٹین کا ایک ڈبہ مفت ملے تھے اور سوئی کی دو ڈبیاں بھی''

اس کے بعد اُن کے مُنہ سے نہ کسی نے ان روپوں کا ذکر سنا تھا نہ باجے کا۔

اور وہ اس دُنیا سے جہاں یہ غم کا سلسلہ چار چھے برس پیچھے جا کر ختم ہو جاتا، بہت دُور نکل آیا تھا۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا اس کے بارے میں خود اسے بہت زیادہ معلوم نہ تھا لیکن وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ اور چاہے کچھ بھی ہو اس میں کوئی بری بات نہیں ہے۔ اس کے ذہن میں بس ایک دھندلا سا خاکہ تھا کہ ایک دن انقلاب آجائے گا، ساری گلیاں اور سڑکیں صاف ہو جائیں گی۔ سارے کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکان رہنے کے قابل بن جائیں گے اور ان کے دروازوں پر لٹکے ہوئے پھٹے پرانے پردے جن پر اس لفظ کی تہمت بھی مشکل ہی سے لگائی جا سکتی ہے، خوبصورت نہیں تو صاف ستھرے پردوں سے

بدل دیے جائیں گے اور ماں کا اپنے بچّے سے پوچھنا کہ "دو روٹیوں میں پیٹ بھر جائے گا یا آدھی اور دے دوں" ختم ہو جائے گا۔ حالات کے نئے رُخ نے اسے بچّے سے یکا یک بڑا بنا دیا تھا اور عمر کا وہ حصّہ جس میں راتوں کا انتظار کیا جاتا ہے کہ ان میں پریاں پھولوں اور پھلوں سے بھری ہوئی ٹوکریوں میں پیارے پیارے خواب لے کے آتی ہیں اس سے دُور ہی دُور دامن بچا کر نکل گیا تھا۔

وہ ہوٹل کے باہر سڑک کے کنارے کھڑا ہوا تنویر کو بہت دیر تک دیکھتا رہا جو اپنے اونچے قد کی وجہ سے بہت دور تک نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا اور جب اس کے لمبے لمبے، لہراتے ہوئے بال بھی جو کبھی کبھی چمک اُٹھتے تھے یا اپنے وجود کا واہمہ پیدا کر دیتے تھے فاصلوں میں کھو گئے تو وہ قیصر باغ کی طرف چل دیا لیکن چوراہے سے تھوڑا پہلے ہی اُسے جانے کیا خیال آیا اور وہ داہنے ہاتھ کی کتابوں کی ایک دوکان میں داخل ہو گیا۔

قیصر باغ کی نکّڑ میٹنگ میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔

■ ■

پندار کا صنم کدہ۔۔۔۔

بھائی میرے تم نے کمال کا افسانہ لکھ ڈالا، ''سگ گزیدہ'' نہیں وہ دوسرا، ''شرطیں'' مجھے تو ایسا لگا کہ اردو میں بھی کوئی 'چیخوف' اور 'مام' کے قد والا مصنف پیدا ہو گیا ہے۔ کیا افسانہ ہے اور کیسی رسائی سے تم نے ایک ایک حرف انتخاب کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن

عابد سہیل اپنے ہم عصروں کی صائب رائے کو اپنے لیے غیر ضروری سمجھ سکتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے کیوں ؟ اس طرح ان کے فن کے بارے میں قارئینِ ادب کے اذہان میں کچھ زیادہ اسپیس ہی پیدا ہوگی ۔ بہتر ہے کہ وہ اسے بے ضرر سمجھیں۔ شائد انگریزی شاعر Pope نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ جو ہوتا رہا ہے وہ سب ٹھیک ہی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

'جینے والے' کے فلیپ پر کسی ادیب و ناقد کی رائے کی عدم موجودگی ہمیں یہ تاثر دیتی ہے کہ صاحبِ کتاب کو اپنی نگارشات کی سحر کاری پر مکمل اعتماد ہے اور اردو ادب میں تیزی سے پھیلتی ہوئی اس رسم کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ وہ نہیں چاہتے کہ قارئین اور افسانے کے درمیان کوئی حائل ہو جائے۔

نسیم عزیزی

ان (عابد سہیل) کے یہاں اس مشینی دور میں زندگی کی تیز رفتاری، دولت کی طلب اور انسانوں کی اس بھیڑ میں تہذیب ، اخلاق ، مروّت اور محبت کی گم شدگی، عالمی تہذیبی قدروں اور پاسداریوں کی شکست صاف نظر آتی ہے اور عام طور پر یہی ان کے افسانوں کی بنیاد بھی ہے۔ جو لوگ عابد سہیل کی شخصیت سے واقف ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ یہی ان کی زندگی کا رویّہ ہے۔

ڈاکٹر نگینہ جبیں

DESIGNED BY FAISAL WAQAR PRINTED AT : KAKORI OFFSET PRESS, LKO. PH. : 2629616